تیسرا رنگ
جاسوسی ڈائجسٹ : نومبر 1985
فریبِ عشق
صبا احمد
سیف الملوک عباسی
محمد نعمان
عقیل قریشی
محمد سجاد بھٹی
صائم بھائی

دو مردوں اور ایک عورت کی مثلث۔ ایک مرد کو محبت میں اوّلیت کا دعویٰ تھا تو دوسرا دوستی میں مخلص ہونے کا دعویدار تھا۔ عورت ان کے درمیان وجۂ کشمکش بنی ہوئی تھی۔ اس کشمکش نے کیسی پُرپیچ کہانی کو جنم دیا۔ کیا کیا فتنے اٹھائے۔ کیا کیا غضب ڈھائے، یہ آپ کو زیرِنظر صفحات کے مطالعے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔

فریبِ عشق

صبا احمد

اُس نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی۔ ہر طرف سائیں سائیں کرتے جنگل کا ہولناک اندھیرا تھا جس میں زمین اور آسمان کے بیچ گھنے اور اُوپر سے پھیلے ہوئے درختوں کی سرسبزی ایک سائبان بن گئی تھی جس میں سے جھلملاتے آنسوؤں جیسے ستاروں کی جھلک بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ بھوت اگر کہیں تھے تو وہ بھی دَم سادھے ایک اور عاشقِ نامراد کو مجنوں اور فرہاد کی طرح اللہ کو پیارا ہونے کا منظر دیکھنے میں محو تھے۔ بہت جلد وہ خود بھی انہی بھوتوں کے قبیلے میں شامل ہوگا اور پھر ایک ایک سے نمٹ لے گا۔ اس نے طے کیا مگر اُسی وقت سلیم نے اُسے باہر دھکیلا۔ ”نیچے اُترو۔“ اس نے ایک گالی ضائع کرتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل بُرا مانے بغیر اُتر گیا۔ بُرا مان کے وہ کسی کا کیا بگاڑ سکتا تھا اور اُس کے لیے سارا دُکھ اسی بات کا تھا کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ کیوں کہ جو کچھ وہ کرچکا تھا اسی کا تو یہ شاخسانہ تھا۔ صرف وہ خود ہی یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ پہلے بھی وہ مجبور اور

بے بس تھا۔ عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتشِ غالب۔ اسد اللہ خاں
نے آداب بجا لا کے کہا اور اُس کی حالت پر خاصے متاسف نظر
آئے لیکن وہ بھی اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ وقت کچھ بھی
نہیں تھا محض احساس کا ایک پیمانہ تھا۔ وہ چھ مہینے جو سلیم نے
دیوارِ زنداں کے حصار میں گزارے، چھ صدیوں کے عذاب
سے زیادہ ہوں گے لیکن اس کے بعد سلیم کے لیے یہ فرصتِ گناہ
چھ دن کی طرح تھی۔ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ آخری
وقت میں بہادر شاہ ظفر نے اپنے عبرت ناک انجام پر سرد آہ بھر کے
کہا۔ ایک اور دھکے سے وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ اس کا
ارادہ مزاحمت کرنے کا بالکل نہیں تھا اور اُس نے وقت کو
فضول خیالات میں صَرف کر دیا تھا۔ یہ بالکل نہیں سوچا تھا کہ
اپنی جان بچانے کے لیے اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اپنے سابق دوست
اور موجودہ دُشمنِ جاں سلیم کو عقل کے دلائل سے قائل کرنے
کی کوشش کرنا چاہیے یا خوش قسمتی کے کسی موقعے کا انتظار کرنا
چاہیے جب بازی اچانک اُلٹی جا سکے۔ جب مرنے کے بجائے
وہ مار دینے پر قادر ہو جائے۔ اگرچہ اس کی اُمید بہت کم تھی۔
یہ خوش فہمی پر مبنی ایک خیالِ خام تھا۔ ایک ایسا اتفاق جو صرف
فلموں کے اختتام کو بدل دیتا ہے۔ ایک بے حد سیاہ رات
اس کے گرد حصار بن گئی تھی۔ اُس کے نامۂ اعمال سے اور اُس
کے مقدر کی سیاہی سے زیادہ کالی۔ ایسی رات کی تو صبح بھی کالی
ہو گی۔ اس نے چلتے چلتے سوچا اور دُنیا کے لیے ہو نہ ہو اس کے
لیے بہر حال ہو گی۔ آسمان پر بجلی لہرائی۔ پل بھر کے لیے اس
کی راہ روشن ہوئی اور اُس نے چند قدم کے فاصلے پر تازہ کھدی
ہوئی مٹی کا ڈھیر دیکھا۔ اپنا جنازہ تو وہ خود اپنے کاندھوں پر
اٹھا کے لایا تھا لیکن اُس نے فرض کیا کہ تدفین اور دُعائے
مغفرت کے لیے اُس کے مدفن کے گرد ماضی، حال اور مستقبل
کے تمام شہیدانِ اُلفت جمع ہیں۔ رومیو اور فرہاد، مجنوں اور
رانجھا، پنّوں اور بوٹا سنگھ اور نامعلوم عاشقانِ کشتۂ وفا کے
ایک جمِ غفیر کی ارواح۔ کتنا پُرسوز اور رقت انگیز منظر ہوتا، اگر
اس المیہ رومانی منظر میں نیلم بھی خونِ دل کو اشکوں میں بہاتی نظر
آتی۔ اس نے اپنے قاتل کی طرف دیکھا۔ پھر میر صاحب گویا ہوئے۔
مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب۔ تو ہوا ہے تمہیں ثواب بہت
اور اس نے شکریہ ادا کیا۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا تصور بھی
محال تھا چنانچہ وہ گلا پھاڑ کے چلاتا تو صرف اتنا ہوتا کہ وفات سے
قبل اُس کا گلا بیٹھ جاتا۔ بظاہر قدرت بھی رقیبِ رو سیاہ کی مدد
پر کمربستہ تھی۔ جب اُسے گڑھے کے کنارے کھڑا کر کے گولی مارنے
کے بعد سلیم مٹی برابر کر دے گا تو بارش صبح ہونے تک جنگل کی
زمین کو جل تھل کر دے گی۔ ایک شاعرانہ خیال یہ ہے کہ آسماں
رات بھر اُس شہیدِ اُلفت کو روئے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ
خس و خاشاک اور سوکھے پتے بہہ کر مٹی کے اُوپر ایک چادر سی
پھیلا دیں گے جس سے ساری زمین ایک ہو جائے گی۔ کہیں نہیں
ہے کہیں بھی نہیں ہو گا سراغ۔ کوئی شرلاک ہومز کا باپ بھی اس
قتل کا سراغ نہیں لگا سکے گا لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ خبیث اور
کینہ پرور سلیم کوئی نشانی باقی رکھے اور نیلم کو بھی انتقام کی دیوانگی
میں اسی مقام تک لے آئے۔ پہلے یہ بتانے کے لیے کہ دیکھ لے
دغاباز حسینہ عرف بے وفا منگیتر۔ یہاں میں نے تیرے ہوس پیشہ
پرستار کو کتے کی موت مار کے گاڑ دیا تھا جو میرا بھی دوست تھا لیکن
اس نے دوستی کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا اور پھر نیلم کو بھی موت کے
گھاٹ اُتار کر اسی لحد میں دفن کر دے کہ تو اب یومِ حشر تک اپنے
حشر کو روتے رہو اور سوتے رہو۔

گڑھا تقریباً تین فٹ قطر کا اور چار فٹ گہرا تھا۔ اندھیرے
میں گہرائی کا اندازہ صحیح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اسحاق کو یقین تھا کہ
وہ بہ آسانی اُس میں دفن ہو جائے گا۔ نرم مٹی پر قدم جما کے
اُس نے سلیم کو دیکھا۔

"تمہاری مسلسل خاموشی سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ
تم کتنے خائف ہو۔" سلیم نے اس کا نشانہ لے کر دیکھا اور
ریوالور والے ہاتھ کو پھر نیچے کر لیا۔ "کچھ کہنا چاہتے ہو تم؟"

"کیا فائدہ کہنے کا جب اُمید کچھ نہ ہو۔" اسحاق نے کہا۔
"البتہ نیلم...."

"نیلم۔" سلیم نے طنز آمیز تلخ لہجے میں کہا۔ "فکر مت کرو،
وہ زندہ رہے گی۔ وہ تمہاری موت کے صدمے کو بہت جلد
بھول جائے گی کیونکہ اُس کی سرشت میں وفا نہیں ہے۔
میں اُس کا منگیتر تھا اور صرف چھ ماہ کے لیے جیل گیا تھا، مرا نہیں
تھا مگر اُس نے مجھے فراموش کر دیا۔"

"فراموش تو خیر نہیں کیا تھا۔" اسحاق نے سوچ کر کہا۔ "کچھ حساب
غلط ہو گیا ورنہ ہم بھاگ جاتے۔"

"اس وقت بھی جھوٹ۔" سلیم نے پھر ریوالور اٹھایا۔ "تم
بھاگ کے کہاں جا سکتے تھے۔ تم کوئی عام آدمی ہو؟"

"اسی لیے میں نے تم کو بتا دیا تھا کہ تم پکڑے جاؤ گے میرے
قتل کے الزام میں بہت جلد تم کو بھی پھانسی ہو جائے گی۔" اسحاق
نے کہا۔ "اور نیلم کو میری موت کا صدمہ تو ہو گا تمہاری موت پر وہ
شیرینی بانٹے گی۔"

"اور پھر کسی تیسرے شخص کی ہو جائے گی۔" سلیم نے ایک
زہریلا قہقہہ لگایا۔ بجلی کی چمک کے بعد ایک گرج کی آواز آئی۔

"مسٹر زاہد اسحاق ایڈووکیٹ، بار ایٹ لا۔ میں نیلم کو بھی قتل کر سکتا ہوں۔ اُس جیسی بلکہ اس سے ہزار درجہ بہتر عورتیں مل سکتی ہیں مجھے۔ رہا پھانسی کا سوال، تو اُس کا کوئی امکان نہیں۔ میرے انتظامات مکمل ہیں۔ میرے پاس ناقابلِ تردید ثبوت ہیں اور انتہائی معتبر گواہ ہیں جو کہیں گے کہ واردات کے وقت میں سیکڑوں میل دور فلاں ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہاں میرے نام سے کمرہ بک ہے اور دستخط خود میں نے کیے ہیں۔"

"ہر مجرم یہی سمجھتا ہے کہ اُس کے انتظامات مکمل ہیں۔"

اسحاق بولا "میری گمشدگی معمولی واقعہ نہیں ہوگی۔"

"ہاں۔ لوگ بہت باتیں کریں گے کہ اتنا بڑا وکیل تھا، اتنا مقبول اور دلکش شخصیت کا مالک۔ انتخابات میں کھڑا ہونے والا تھا۔ صوبائی وزارت میں تو یقیناً آجاتا لیکن سب تقدیر کی بات ہے۔ ایک معمولی عورت کی خاطر اپنا مستقبل قربان کر دیا اور اس کے ساتھ فرار ہو گیا۔ کنگ ایڈورڈ نے مسز سمپسن کے ساتھ شادی کے لیے تخت و تاج برطانیہ کو چھوڑ کر ایک مثال پہلے ہی قائم کر دی ہے۔ تمہارا نیلم کے ساتھ بھاگ جانا بھی ایسا ہی کیس ہوگا۔ دماغ کے خلل کا۔"

"میری ایک وصیت ہے۔ سزائے موت دینے والے بھی آخری خواہش کی تکمیل کے لیے پوچھتے تو ہیں۔" اسحاق نے کہا۔

"سزا میں تم کو مجرم کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔" سلیم بولا۔ "وصیت پر ایک پرانے دوست کی طرح عمل کروں گا۔ بولو کیا کہنا ہے؟"

"نیلم کو میرے قریب ہی دفن کرنا۔ محبت کی روایات کے مطابق۔" اسحاق نے کہا۔ "اور میرے یعنی ہمارے کتبے پر یہ شعر لکھ دینا۔

اے مسافر جانے والے دیکھ جا منہ پھیر کر
ہم بیچارے کس لیے لیٹے ہیں رستہ گھیر کر۔"

"اچھا! تم اب تک سمجھ رہے ہو یہ مذاق ہے، میں بخش دوں گا تمھیں۔" سلیم چلایا۔

"ہاں۔ آخر میں اور تم دوست تھے۔ تم بیس برسوں کی دوستی کو ایک عورت کی بے وفائی پر قربان نہیں کرو گے۔"

"ذلیل، کمینے۔ نام مت لے دوستی کے مقدس رشتے کا۔" سلیم نے چیخ کر کہا اور ایک فائر کیا۔ رات کے سناٹے میں فائر کے ساتھ بادل کے کڑکنے کی آواز شامل ہو گئی۔ اسحاق سر کے بل گڑھے میں گرا۔ لہو کی تازہ مہک کے ساتھ گیلی نرم مٹی کی خوشبو اُس کے نتھنوں میں پہنچی۔ خون اُس کا اپنا تھا۔ مٹی اُس کے مدفن کی تھی۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ پسینے میں اُس کا جسم تر تھا اور اُس کا وجود اندر سے لرز رہا تھا۔ نجانے یہی ایک خواب ہر شب اُس کے اعصاب کو منتشر کرنے کے لیے کیوں نظر آتا تھا۔ یہ کوئی نفسیاتی مرض بننے لگا تھا۔ ورنہ ایک ہی خواب کا ہر رات نظر آنا چہ معنی دارد؟ ویسے تو دن میں کھلی آنکھوں سے بھی وہ یہی خواب دیکھتا تھا اور اُس کے خیالات پر آسیب منڈلاتے رہتے تھے چنانچہ اُسے لگتا تھا کہ وہ پاگل نہ ہوا تو کسی رات سوتے میں ہارٹ فیل ہونے سے مر جائے گا۔

اس نے میز کی دراز میں سے ویلیم کی شیشی نکالی اور پانی کے آدھے گلاس کے ساتھ دو گولیاں مزید نگل لیں۔ اُس نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا لیکن اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ پہلے تو اُس کے ہاتھ سے خالی گلاس چھوٹ گیا۔ پھر ٹیلی فون کی گھنٹی نے چلانا شروع کیا تو وہ اچھل پڑا۔ اُس نے ایک دم ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" اسحاق نے زبیدہ کی مشکوک نظروں سے نظریں چرا کے کہا۔

"اسحاق۔ جاگ رہے ہو تم بھی؟" نیلم کی آواز آئی۔

"ہاں۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" اسحاق نے ضبط سے کام لے کر کہا۔

"میں نے ابھی ابھی ایک بہت بھیانک خواب دیکھا ہے۔" وہ بولی۔ "بہت ڈراؤنا خواب۔"

"پھر کیا ہوا؟ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟" اسحاق نے پُرسکون رہنے کی کوشش کی۔

"اسحاق۔ کل کیا ہوگا ڈیئر! تم نے کچھ سوچا؟" نیلم نے کھوکھلے، بے جان اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" اسحاق نے کن اکھیوں سے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ وہ اُسے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی اور نفرت کے سایے آثار اُس کی صورت کو مسخ کر رہے تھے۔ اسحاق نے اُسے نظرانداز کر دیا۔ "میں نے کہا نا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ اُلو کی پٹھی۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ زبیدہ کی موجودگی میں میرے لیے اُس کو تسلی دینا بھی کتنا مشکل ہو جائے گا اور ہزار بار تو پوچھ چکی ہے یہ سوال۔ کیا جواب نہیں جانتی وہ؟

"آدھی رات کو کس بے وقوف نے فون کیا تھا؟" زبیدہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تمہارے باپ نے۔" اسحاق نے کروٹ لے کر سوتے ہوئے کہا۔

"والدہ ہوں گی تمہاری۔" زبیدہ نے کہا۔ "میرے باپ کی آواز زنانہ نہیں ہے۔"

مرحوم والدہ کے بارے میں بہو کی یہ گستاخی ناقابلِ برداشت تھی لیکن اُس نے جھانپڑ رسید کرنے کا ارادہ صبح پر ملتوی کر دیا۔

لیکن خواہش اور کوشش کے باوجود وہ سو نہ سکا۔ یہ خیال اُس کو کچوکے دیتا رہا کہ کل ـــ یعنی آج، کیوں کہ رات کے دو بجے اگلے دن کا آغاز ہو گیا تھا، سلیم رہا ہو جائے گا۔

"سلام صاحب۔" پٹھان چوکیدار نے حسبِ عادت اسٹول سے اُٹھ کر سیلیوٹ جھاڑا۔ اسحاق نے ہر روز کی طرح سر کی جنبش سے جواب دے کر نکلنا چاہا لیکن چوکیدار ایکدم آگے بڑھ آیا۔

"بیگم صاحب یہ چابی دے گیا ہے۔" اس نے فلیٹ کے مقفل دروازے کی دو چابیاں اَدب سے پیش کر دیں۔

"اچھا... !... کب... میرا مطلب ہے بیگم صاحبہ کب گئیں؟" اسحاق نے حیرانی پر قابو پا کے کہا۔

"ابھی صبح سویرے۔ ہم نے ٹیکسی لا کے دیا۔" چوکیدار نے کہا۔ "بولا آپ نہ آئے تو آپ کا آفس میں دے دے۔ ہم آن کا سوٹ کیس بھی اٹھا کے لایا۔ ایک بڑا، ایک چھوٹا۔"

"اور... کوئی بات... کوئی پیغام نہیں دیا اُس نے۔" اسحاق نے بے خیالی میں کہا۔ چوکیدار نے نفی میں سر ہلا دیا اور اسحاق کے دل میں ایک نامعلوم خلش بیدار ہو گئی۔ نیلم کی اس حرکت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ وہ یہاں بالکل محفوظ تھی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ فلیٹ کہاں ہے اور اسحاق نے کس نام سے کرائے پر لیا ہے۔ چوکیدار کے خیال کے مطابق وہ خالد محمود کسٹم انسپکٹر تھا جو اپنی بیوی عالیہ کے ساتھ فرسٹ فلور کے کارنر فلیٹ میں مقیم تھا۔ اُس کی ڈیوٹی کوسٹ گارڈز کے ساتھ تھی۔ چنانچہ اُس کے گھر سے جانے کا اور لوٹ کر گھر آنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ اس آراستہ گھر میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ یہاں تک کہ ٹیلی فون بھی تھا۔ سلیم رہا ہو جانے کے بعد اسکاٹ لینڈ یارڈ کو بھی پیچھے لگا دیتا تو نیلم کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا اور اسحاق بھی بالکل محفوظ تھا۔ وہ معذرت اور افسوس کے ساتھ یہ تو کہہ سکتا تھا کہ مصروفیت میں اُسے نیلم کی خیریت معلوم کرنا یاد نہیں رہا مگر یہ کوئی جُرم نہیں تھا۔ نیلم اگر سلیم کو نہ ملتی تو وہ حیرانی کا اظہار کرتا اور افسوس کرتا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کیا جانے نیلم اب کہاں ہے اور یہ بھی نیلم ہی بتا سکتی ہے کہ کہیں جانے سے قبل اُس نے سلیم کو یا اسحاق کو مطلع کیوں نہیں کیا۔ اس نے نوکری کیوں چھوڑی تھی اور کب چھوڑی تھی۔ پھر وہ فلیٹ سے کیوں چلی گئی۔

دروازہ کھول کر اس نے دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ رات کو نیلم نے بھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ دونوں ایک جیسے انجام کے خوف میں مبتلا ہیں جو خواب بن کے اُنھیں ڈراتا ہے مگر وہ عورت تھی۔ ناقص العقل اور کم ہمت۔ شاید خوف اس پر غالب آ گیا تھا۔ اسحاق کی یقین دہانی اور تسلی کے باوجود وہ فرار ہو گئی۔ وہ یقیناً سلیم سے ڈر کے فرار ہو گئی تھی۔ سلیم کے جیل جانے سے پہلے وہ اُس کی منگیتر تھی اور یہ بات زمانہ جانتا تھا۔ اب اس میں سلیم کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی، نہ وہ اُس سے شادی کر سکتی تھی اور نہ یہ بتا سکتی تھی کہ وہ منگنی ختم ہوئی۔ اب سلیم کی جگہ اس نے سلیم کے جگری دوست زاہد اسحاق ایڈووکیٹ بار ایٹ لا کا انتخاب کر لیا ہے۔ سلیم کو چرس اور افیون بیچنے کے الزام میں ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی چنانچہ اب نیلم کے لیے اُس جیسے بدنام آدمی کے ساتھ شادی کا تصور بھی محال تھا۔ وہ خود بھی کوئی نیک نام نہیں تھی۔ گھر سے فلم اسٹار بننے کے شوق میں نکلنے والی نیلم صرف ایکسٹرا ہی تھی اور شاید ایکسٹرا بھی نہ رہتی اگر شہر کو اچانک اسٹیج ڈراموں کی وبا لپیٹ میں نہ لے لیتی۔ یہ ڈرامے اخباروں اور نقادوں کی سخت تنقید کے باوجود ہر ہوٹل، کلب اور کالج کے آڈیٹوریم میں جاری تھے۔ ان میں پھکڑپن، گھٹیا مذاق۔ بازاری جملوں۔ ذومعنی فحش باتوں اور بے تکے مکالموں پر مبنی بے سروپا پلاٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن فرسٹریشن کے شکار اور احساسِ محرومی کے مارے ہوئے نچلے طبقے کے نوجوانوں سے لے کر ہر کلاس کے بگڑے ہوئے رئیس زادے سب ان پر یلغار کر رہے تھے۔ ان ڈراموں کے کرداروں نے نیلم کو تھوڑی سی شہرت عطا کر دی تھی اور اُسے رقص میں سُدھ بُدھ رکھنے کے باعث اچھے خاصے رول ملنے لگے تھے۔ اسحاق خود بھی ان لوگوں میں تھا جو سمجھتے تھے کہ یہ رقص نہیں، اعضا کی شاعری نہیں، سفلی جذبات کو مشتعل کرنے والی حرکات قبیحہ ہیں لیکن اُس نے نیلم کو چھ ماہ میں اور زیادہ گرنے سے بچا لیا تھا۔ اگر سلیم جیل نہ جاتا تو ان دونوں کی شادی یقیناً ہو جاتی اور نیلم اسٹیج کا رُخ کرنے کے بجائے امورِ خانہ داری سنبھالتی یا سلیم کے ساتھ فلموں میں جلوہ گر ہوتی۔ سلیم کے جیل جانے سے مستقبل کے بہت سے ستونوں پر قائم پوری عمارت منہدم ہو گئی تھی۔

اسحاق سخت کوفت کا شکار تھا۔ عورت ذات کی عقل

پر اُس نے کبھی بھروسا نہیں کیا تھا لیکن نیلم نے تو اپنی حماقت سے اُس کو تباہ کر دیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ اسحاق کے اعصاب پر سوار تھی اور اپنی نیک نامی، پریکٹس اور مستقبل کے خوابوں کو بچانے کے لیے اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نیلم سے شادی کرے گا۔ اُسے سلیم کی کھلی رقابت مول لینی ہوگی۔ اُسے بتانا پڑے گا کہ دوست بن کے اُس نے مارِ آستین ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اُس کی عدم موجودگی میں دوستی کا تقدس پامال کر دیا ہے لیکن قصوروار وہ اکیلا نہیں ہے۔ اگر نیلم کے جذبات کے دھارے کا رُخ بدل گیا ہے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ تقدیر کو الزام دینا غلط ہوگا کیوں کہ پہلی غلطی اُس نے کی تھی۔ وہ اُسی شرافت اور عزت کی زندگی پر قانع رہتا تو کچھ نہ گنواتا۔ اب حالات مختلف ہیں اور نیلم اُس کو قبول نہیں کرتی تو دنیا میں کوئی اُسے غلط کہہ سکتا ہے اور نہ مجبور کر سکتا ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے اور نیلم کے التفات کے جواب میں اُس سے مزاحمت نہ ہوئی تو وہ اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے۔ آدمی خطا کار اور کمزور ہے۔ حوا نے آدم کو بہکا دیا تھا۔ نیلم نے اُسے بہکا دیا۔ وہ اپنے جذبات کو مشین کی طرح کنٹرول نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اب جو ہے سو ہے۔ وہ اپنی بیوی سے ہر حال میں طلاق یا دوسری شادی کی اجازت حاصل کرے گا اور پھر نیلم سے شادی کرے گا۔ سلیم کو بھی چاہیے کہ وہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرے اور...

لیکن سلیم تو ابھی رہا بھی نہیں ہوا تھا اور نیلم ڈر کے بھاگ گئی تھی۔ اس کے حلق کا ذائقہ کڑوا ہو گیا اور اُس نے آدھی سگریٹ کو بے رحمی سے فرش پر مسل دیا۔ بے وقوف۔ یہی کرنا تھا تو مجھے کیوں خوار کیا۔ میں بچاتا اُسے سلیم سے۔ قانون کی مدد حاصل کرتا۔ یا خود سلیم کی راہ میں حائل ہو جاتا کہ نیلم اب میری ہے اور وہ مشہور فلمی ڈائیلاگ۔ کہ تم میری لاش پر سے ہی گزر کے نیلم تک پہنچ سکتے ہو۔ کچھ بتائے بغیر سامان لے کر بھاگ جانے سے مسئلہ حل تو نہیں ہوا۔ وہ کہاں جائے گی؟ اپنے اسی پرانے فلیٹ میں جس کے آدھے حصے میں وہ ایکسٹرا اسپلائر رہتی تھی؟ سلیم وہاں بھی پہنچ جائے گا اور نیلم وہاں نہ گئی تو کون سے گوشۂ گمنامی میں رہے گی؟ اسٹیج پر آئے بغیر کھائے گی کہاں سے۔ سلیم تو اسٹیج پر جا کے بھی حاضرین و ناظرینِ باتمکین کے سامنے اس کو چوٹی سے پکڑ کے لے جا سکتا ہے، خواہ بعد میں اُسے مزید تین ماہ جیل میں گزارنے پڑیں۔ سلیم سے یوں نجات ناممکن ہے۔

سخت مایوسی اور جھنجلاہٹ کے عالم میں اُس نے کچن کا رُخ کیا۔ آفس جانے سے پہلے ڈٹ کر ناشتا کرنا اور پھر اخبار دیکھنا اُس کا معمول تھا لیکن گزشتہ شب اُس پر بہت گراں گزری تھی اور آج کا دن بھی بہت بھاری تھا چنانچہ وہ کچھ کھائے بغیر چل پڑا تھا۔ زبیدہ اُس وقت اطمینان سے ڈائننگ ٹیبل پر اکیلی بیٹھی کھانے میں مصروف تھی اور اُس نے آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسحاق نے کچن میں جا کے کافی بنانے اور فریج میں سے کچھ نکال کر کھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فلیٹ اُس نے بارہ سو روپے ماہانہ پر لیا تھا اور اُس کا ایک سال کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔ ایک مہینے میں اُس نے فلیٹ کو ضرورت اور آسائش کے تمام اسباب سے آراستہ کر دیا تھا کیوں کہ اُس کا خیال بعد میں اسی فلیٹ کو خرید لینے کا بھی تھا۔ نیلم کو شادی کے بعد کہیں نہ کہیں تو رہنا ہی ہوگا۔ قصرِ زبیدہ میں اس کا مقبرہ تو بن سکتا تھا مگر اُسے بیوی نمبر دو کی حیثیت سے رہنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ مسئلہ بہت ٹیڑھا تھا۔ پہلے سلیم سے نمٹنا، قانونی طور پر۔ شرافت اور دوستی کے حوالے سے یا بزورِ بازو۔ پھر زبیدہ سے عقدِ ثانی کی اجازت حاصل کرنا۔ انہی تین طریقوں سے، عام آدمی کے لیے دونوں کام وقت طلب تھے یا مشکل تھے۔ اسحاق جیسے نامور ایڈووکیٹ کے لیے سب سے بڑی مشکل اپنی عزت کو بچانا تھا۔ وہ کسی رسوا کن اسکینڈل میں ملوث ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ گھٹیا اخبارات کو یہ سنسنی خیز سُرخی فراہم نہیں کر سکتا تھا کہ مشہور قانون داں زاہد اسحاق نے سزا یافتہ ایکٹر کی اسٹیج ڈانسر منگیتر سے دوسری

ٹرین کے سفر کے دوران رحمت کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص ہر آدھے گھنٹے بعد کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتا پھر پیر کو زمین پر اس طرح رگڑتا جیسے سگریٹ بجھا رہا ہو۔ رحمت سے رہا نہ گیا تو بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

"بات یہ ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "میں سگریٹ چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے جب بھی سگریٹ کی طلب محسوس ہوتی ہے میں اپنے آپ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں نے ابھی ابھی سگریٹ بجھایا ہے۔ اس طرح سگریٹ پینے کی خواہش دب جاتی ہے۔ دو ہفتے پہلے میں روزانہ تیس فرضی سگریٹ بجھایا کرتا تھا اور اب میں اٹھائیس پر آ گیا ہوں۔"

شادی رچالی۔ اس کے کیریئر میں کامیابی کے بہت سے دروازے ابھی کھلے ہوئے تھے۔ وہ سیاست کے میدان میں اترنے کے لیے بار ایسوسی ایشن کے صدر کا انتخاب لڑنا چاہتا تھا جس میں اُس کی کامیابی کے امکانات ہمیشہ روشن رہے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ بلامقابلہ جیت سکتا ہے۔ اگلی منزل سیاسی بیان بازی کی تھی۔ پھر کچھ صحافت کے ذریعے پبلسٹی کی مہم اور دیدہ دانستہ حکومت کے راست اقدام کے خلاف غلط بیانی، گرفتاری، پوسٹرز اور بیانات۔ پھر صوبائی انتخابات کی مہم۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے وہ اسمبلی اور وزارت تک کے مرحلے طے کرنے کے لیے لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔

لیکن ابھی تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس لائحہ عمل میں نیلم سے عقدِ ثانی کب شامل ہوا۔ وہ عقدِ ثانی کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا لیکن اس کیس میں مخالفین کو یہ موقع ہرگز فراہم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ شادی کے معاملے کو اسکینڈل بنا کے اُسے رسوا کریں۔ اس پر کیچڑ اچھالیں اور اُس کے لیے مستقبل کی کامیابی کے در بند کر دیں۔ مشکل یہ تھی کہ نیلم جیسی عورت کے کیس میں۔ کیچڑ کے داغ سے بچنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا دریا میں کود کر بھیگنے سے بچنا۔ اگر وہ عقل سے کام لیتا تو نیلم کوئی مسئلہ نہیں تھی لیکن مجبوری اور بے بسی کا احساس تو اسی مقام پر آکے ہوتا تھا جب نیلم کے بغیر اُسے سب بے مقصد لگتا تھا اور وہ عقل کے سارے دلائل کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود نیلم کو زندگی کے لیے اتنا ہی ناگزیر سمجھتا تھا جتنا آکسیجن، دھوپ یا دورانِ خون کو۔ حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا اس کے گرد لاکھوں افراد تھے جو کسی بھی نیلم کے بغیر جی رہے تھے اور ایک مقصد پر ہزار نیلموں کو قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے لیکن صرف چھ مہینے میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ نیلم کی خاطر اپنا کیریئر تباہ کر سکتا ہے، قصرِ زبیدہ اور زبیدہ کو چھوڑ سکتا ہے اور زبیدہ اُسے نہ چھوڑے تو قتل کر سکتا ہے۔ سلیم جیسے دوست کو چھوڑ سکتا ہے اور سلیم اگر نیلم کو نہ چھوڑے تو وہ سلیم کو بھی ... پاگل پن۔ دیوانگی۔ عقل و خرد سے بیگانگی۔ زمانہ جو نام چاہے دے۔ اسحاق کے لیے اس حقیقت کا نام نیلم کے سوا کچھ نہ تھا۔ گزشتہ چھ ماہ میں اُسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ دلدل میں اُترنے کے بعد اس سے نکلنا کتنا محال ہوتا ہے۔

کچن سے لوٹتے ہوئے اُس کی نگاہ بیڈروم میں گئی اور وہ کافی کا مگ ہاتھ میں لیے دروازے میں رُک گیا۔ بیڈ پر مختلف اشیا کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

ایک طرف وہ سب ڈبے تھے جن میں بیش قیمت ملبوسات تھے۔ ساریاں اور سوٹوں کے کپڑے۔ اس نے ایک پیکٹ کو شناخت کیا جو اُس نے کم سے کم چار مہینے قبل نیلم کو پیش کیا تھا۔ اس کے لیے حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک نیلم نے یہ سوٹ درزی کو سلنے کے لیے بھی نہیں دیا تھا۔ چند پیکٹ تو ایسے تھے کہ اُن پر لپٹا ہوا رنگین گفٹ پیپر بھی اصلی حالت میں نظر آتا تھا۔ جیولری کے تین مخملی باکس بالکل الگ رکھے تھے۔ گہرے سُرخ، زرد اور نیلے رنگ کے ہر ڈبے میں ہر زیور اُسی طرح موجود تھا جیسے اُسے جیولر کی دُکان میں رکھا گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ نیلم نے ان تمام چیزوں کو بلا استعمال کیوں رکھا تھا اور اب کسی وجہ کے بغیر اس فلیٹ میں کیوں چھوڑ گئی تھی۔ جوتوں کے تین ڈبے، پرفیوم کی چار شیشیاں، دو ہینڈ بیگ، یہ سب نئے کے نئے سیلوفین کے بیگ میں بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھے گئے تھے۔ ایسا تو کوئی عورت نہیں کرتی اور وہ خود کس قدر احمق تھا کہ صرف نیلم کو دیکھتا رہا۔ اس نے کبھی تحفہ دینے کے بعد نہیں سوچا کہ نیلم نے اُس کا دیا ہوا کوئی ملبوس پہنا کیوں نہیں۔ اس کے نذر کیے ہوئے زیورات کو آرائشِ حسن کے لیے استعمال کیوں نہیں کیا۔ اسے تو خود فرمائش کرنا چاہیے تھی کہ ذرا پہن کر دکھاؤ۔ وہ ہمیشہ اچھے کپڑوں میں ہی ہوتی تھی۔ چنانچہ اسحاق کا دھیان کبھی اس طرف گیا ہی نہیں۔ اُسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ نیلم کے حسنِ سحر آفریں میں آرائش و زیبائش کی کمی ہے اور اب وہ ساری چیزیں قبول کرنے اور جمع کرنے کے بعد اس فلیٹ میں چھوڑ گئی تھی۔ وہ اپنا سب سامان لے گئی تھی لیکن ان چیزوں کو اُس نے اپنا نہیں سمجھا تھا۔ آخر کیوں؟

فلیٹ کو مقفل کرنے کے بعد وہ باہر نکلا تو چوکیدار نے پھر اُسے سلام کیا مگر وہ خیالات کے گرداب میں غوطہ زن تھا۔ ذہنی اُلجھن کے باعث اس سے پہلی غلطی یہ ہوئی کہ اپنی کار کے بجائے اس نے دوسری کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور چابی نہ لگنے پر کوفت کا شکار ہوا۔ لاک کو بھی اسی وقت خراب ہونا تھا۔ اس نے چابی سے تالے کے ساتھ زبردستی جاری رکھی۔ اچانک کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کون ہو تم؟ خبردار! ہلنے کی کوشش مت کرنا۔ میں گولی مار دوں گا۔"

اسحاق نے پیچھے سے گردن دبوچنے والے کو ایک جھٹکا دے

کر الگ کیا۔ "گولی کے بچے۔ مجھے جانتے ہو؟"

فریقِ ثانی اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہ تھا اور اُس کا خیال تھا کہ قلم پشت سے لگا کے ریوالور کی نال کا ڈراما کیا جاسکتا ہے۔ کار چور ویسے ہی حواس باختہ ہوگا اور پکڑا جائے گا۔ وہ نسبتاً کمزور بھی تھا چنانچہ اسحاق کے دھکے سے وہ کار کے بونٹ پر گر پڑا "بدمعاشی... چور، کار چُراتے ہو" وہ چلّانے لگا "چوکیدار...؟"

"یہ میری کار ہے۔ یو باسٹرڈ" اسحاق نے اُسے سیدھا کھڑا کر دیا" اور میں زاہد اسحاق ایڈووکیٹ بار ایٹ لا ہوں۔ سارا شہر مجھے جانتا ہے۔"

نوجوان کے اوسان خطا ہوگئے "سر۔ دیکھیے۔ آئی ایم سوری۔ مگر غلطی آپ کی ہے۔ یہ میری کار ہے۔ آپ کی کار پیچھے والی قطار میں ہے۔ دونوں کا ایک ہی ماڈل اور رنگ ہے۔ آپ بھول گئے۔"

اسحاق نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے پیچھے دیکھا۔ اُس کی گاڑی سائے میں دوسری کاروں کے درمیان موجود تھی۔ نوجوان نے غلط نہیں کہا تھا۔ دونوں کورولا کے اٹھاسی ماڈل تھے اور دونوں کا رنگ ڈارک براؤن تھا۔ نمبر کا فرق اسحاق نے بعد میں دیکھا لیکن اُس وقت تک چوکیدار آچکا تھا۔ اسحاق نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر حیران ہے۔ آخر خالد محمود صاحب نے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟

"آئی ایم سوری۔ تم کو چوٹ تو نہیں آئی" اسحاق نے شرمندگی سے کہا "غلطی میری تھی کہ میں نے نمبر نہیں دیکھا تھا۔ یہ لو۔ میرا کارڈ رکھو۔ کبھی کوئی پرابلم ہو تو آجانا۔"

نوجوان نے اُس سے ہاتھ ملایا "میں عبدالکریم ہوں۔ اسی عمارت میں سیکنڈ فلور پر کارنر کا فلیٹ میرا ہے۔ میں کریم اینڈ سنز کا پروپرائیٹر ہوں" اس نے اپنا کارڈ اسحاق کو پیش کیا جسے اسحاق نے مُروّتاً جیب میں رکھ لیا۔ جب اسحاق اپنی گاڑی میں روانہ ہوگیا تو دروازے کے باہر سائڈ میں لگے ہوئے مرر میں اس نے چوکیدار اور اس نوجوان کو باتیں کرتے دیکھا۔ سر نکال کے دیکھنے پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چوکیدار اب اسحاق کا کارڈ کریم کو واپس کر رہا تھا۔ آخر اُسے کیا ضرورت ہے یہ بتانے کی کہ جو صاحب چلا گیا وہ وکیل نہیں کسٹم افسر ہے اور اُس کا نام زاہد اسحاق نہیں خالد محمود ہے۔ چوکیدار نے واپس جاتے ہوئے طے کیا۔ ایک چوکیدار کے لیے دونوں ہی سے ڈرنا بہتر ہے۔ خواہ وہ وکیل ہو یا کسٹم افسر یا کچھ بھی نہ ہو۔ آدمی شریف ہے اور شریف تو اسمگلر بھی نظر آتے ہیں لیکن کسی کی زبان سے ایک غلط لفظ نکل جائے تو آدمی کی زبان کاٹ دیتے ہیں یا آدمی کو کاٹ دیتے ہیں۔

آفس پہنچنے کے بعد بھی اسحاق کچھ نہ کرسکا۔ اس کے ماتحت وکیل مختلف مقدمات میں پیش ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر کیس کی فائل پڑھ کے انھیں ہدایات دیتا تھا اور وہ انہی ہدایات کی روشنی میں مقدمات کی پیروی کرتے تھے۔ اہم اور پیچیدہ مقدمات اور ہائی کورٹ کے کیس میں وہ خود پیش ہوتا تھا اور انتہائی اہم مقدمات میں کسی پینل کے ساتھ رہتا تھا لیکن چھ مہینے سے ماتحت وکیل خود مختار تھے اور اپنی صلاحیت کے ساتھ اپنے محدود تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے مقدمات لڑ رہے تھے۔ وہ تنخواہ دار وکیل تھے۔ چنانچہ فرم کی گڈول سے ان کو فائدہ ضرور پہنچ رہا تھا مگر مقدمات کے ہارنے سے اُن کی آمدنی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ قدرتی طور پر اسحاق کی عدم دلچسپی نے ان کو بھی کاہل بنا دیا تھا چنانچہ گزشتہ چھ ماہ میں بیشتر مقدمات کے فیصلے ان کے خلاف ہوئے تھے اور ان میں ایسے مقدمات بھی تھے جن کی اپیل کے لیے مؤکلوں نے دوسرے بڑے وکیل کا انتخاب کر لیا تھا۔ اسحاق کی ہدایت پر بڑے مقدمات میں اگلی پیشی کی تاریخ لینے کا سلسلہ اتنا دراز ہوگیا تھا کہ دو مقدمات خارج ہوگئے تھے۔ ایک میں عدم پیروی کی بنا پر سو فیصد حق میں ہونے والا فیصلہ فریقِ مخالف کے حق میں ہوگیا تھا۔ اس صورت حال کا اثر آمدنی پر بھی پڑا تھا اور فرم کی نیک نامی پر بھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اسحاق جیسا ذہین، محنتی اور مستعد وکیل یکلخت اتنا بے پروا کیوں ہوگیا ہے اور اُسے اپنی گڈول کا خیال کیوں نہیں۔ دو ماہ سے اخراجات تک پورے نہیں ہو رہے تھے اور فرم کا خسارہ اسحاق نے اپنے بینک اکاؤنٹ سے پورا کیا تھا۔ رہی سہی کسر نیلم نے پوری کر دی تھی۔ زبیدہ کے شاہانہ اخراجات ہی کم نہ تھے کہ اسحاق نے نیلم کا روگ لگا لیا اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں کا بینک بیلنس صفر ہو کے اوور ڈرافٹ میں تبدیل ہوگیا لیکن اسحاق کو مالی حالات کی ابتری کا علم اس وقت ہوا جب بینک کی جانب سے انتہائی شائستگی کے ساتھ معذرت کی گئی اور ایک چیک ان ریمارکس کے ساتھ واپس کر دیا گیا کہ موجودہ حالات میں اس سے زیادہ اوور ڈرافٹ ہمارے اختیار میں نہیں۔ اسحاق نے اس کا فوری حل یہ نکالا کہ اپنا سابقہ مکان ساڑھے چار لاکھ میں فروخت کر دیا۔ قصرِ زبیدہ میں منتقل ہونے سے پہلے ان کے پاس گلبرگ میں ایک کنال کی کوٹھی تھی۔ جس سے اب تین ہزار روپے ماہانہ کرایہ وصول ہوتا تھا۔ کرائے دار نے اس قیمت

پر کوٹھی کو خود ہی خرید لینے کا فیصلہ کیا اور رقم یکمشت ادا کر دی۔ مالی بحران ٹل گیا اور زبیدہ کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ اب اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ بینک میں نقد رقم کتنی ہے اور اُس کے واجبات کی پوزیشن کیا ہے۔

دوپہر تک اس کے سامنے معاشی حالات کی جو تصویر آئی وہ انتہائی حوصلہ شکن تھی۔ اس کو معلوم ہوا کہ "قصرِ زبیدہ" کا پراپرٹی ٹیکس پانچ سال سے ادا نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے چیمبر کا کرایہ تین ماہ پہلے ادا کیا گیا تھا اور نئے مقدمات اتنے کم ملے ہیں کہ آئندہ ماہ اُسے ایک بھی ماتحت وکیل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ شاید اپنی لیگل فرم کو کسی مختصر سے آفس میں منتقل کرنا ہوگا اور عملے میں ایک سیکرٹری کے ساتھ گزارا کرنا ہوگا جو ٹائپ بھی جانتا ہو۔ سارے واجبات کی ادائیگی کے بعد اُس کے پاس نقد کی صورت میں جو رقم بچتی تھی وہ ایک ماہ کے اخراجات کی کفالت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان حالات میں اس کے لیے فوری فیصلے ناگزیر تھے۔ انٹرکام پر اُس نے مسز رحمان کو طلب کیا جو گزشتہ بارہ سال سے اس کی سیکرٹری تھی۔ شرافت اور فرض شناسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی اور اپنے دو بچوں کی پرورش خود کر رہی تھی کیوں کہ ان کے باپ نے ماں کو بغیر وجہ بتائے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے متعلق ایک اطلاع یہ ملی تھی کہ وہ دبئی میں اپنی نئی بیوی کے ساتھ شاد و آباد ہے لیکن بعد میں اس کا خط جرمنی سے آیا جس میں اُس نے طلاق نامہ ارسال کیا تھا۔ اسحاق دفتری امور میں مسز رحمان کی صلاحیت کے ساتھ اس کے کردار کی عظمت کا بھی معترف تھا۔ اس نے مختصراً اپنے مالی حالات اور اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کیا اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تمام وکیلوں سے معذرت کر لی جائے۔ چپراسی، ٹائپسٹ اور منشی کی چھٹی کر دی جائے۔ مسز رحمان کے لیے یہ سانحہ غیر متوقع نہیں تھا مگر اُسے فرم کے ساتھ وابستہ پرانے نمک خواروں کے بے روزگار ہونے کا دکھ ہوا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" مسز رحمان نے وہ بات کہی جو اب تک اسحاق کے لبوں تک نہیں آئی تھی۔

"مجھے ندامت ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ جائیں۔" اسحاق نے کہا۔ "لیکن میں بے حد مجبور ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو سیکرٹری ہو وہی ٹائپسٹ بھی ہو اور فائلوں کو بھی ہینڈل کرے۔"

"میں یہ سب کر سکتی ہوں سر۔ میں نے ایف ای ایل تو کر لیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ندامت مجھے اس بات پر تھی کہ تم پر اضافی کام کا بوجھ ہو گیا۔" اسحاق نے کہا۔ "کسی اضافی تنخواہ کے بغیر۔"

"میری گزر اوقات آسانی سے ہو رہی ہے سر۔" مسز رحمان نے کہا۔ "مجھے صرف تنخواہ ہی نہیں، تحفظ بھی چاہیے۔"

"کیا تمہیں کبھی عدم تحفظ کا احساس ہوا؟" اسحاق نے کہا۔ "حالات سے انسان نہیں بدلتے۔ تم میرے لیے وہی ہو تو میں بھی وہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے مجھے اضافی کوشش کرنا ہوگی۔ ابھی نقصان ضرور ہوا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ میں سنبھل نہ سکوں۔ خدا نے چاہا تو ہم سال دو سال میں پھر پرانی گُڈ وِل بنالیں گے اور اس وقت میں تمہاری اضافی ذمے داریوں کا صلہ بہت بہتر طور پر ادا کر سکوں گا۔ اگر تم نے ایل ایل بی کر لیا تو تم میری فرم کی پارٹنر ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے جو کبھی نہ کبھی وفا ہوگا۔ بس مجھے تھوڑے سے وقت کی ضرورت ہے۔"

"صرف وقت کی نہیں سر! یقین کی، ہمت کی اور... توجہ کی۔" مسز رحمان نے نظریں جھکا کے کہا اور اسحاق سمجھ گیا کہ توجہ سے اُس کی مراد کیا ہے۔ مسز رحمان کو معلوم تھا کہ گزشتہ چھ ماہ سے اُس کی توجہ کا مرکز نیلم رہی ہے جس کی وجہ سے فرم کے معاملات عدم توجہ کا شکار رہے ہیں۔ مسز رحمان بہت سی ایسی باتیں بھی جانتی تھی جو شاید زبیدہ بھی نہیں جانتی تھی۔

"میں نے تمہاری بات کا برا نہیں مانا۔ اس لیے کہ تم اپنی شکایت میں مخلص ہو۔" اسحاق نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ اپنے کاروباری معاملات کے علاوہ میری توجہ کسی کی طرف نہ رہے۔ ناؤ پلیز، یہ خطوط بنا لائیے۔ ادائیگی کے چیک میں آپ کو دیتا ہوں۔ کسی بروکر سے رابطہ قائم کر کے ذرا کم قیمت کا آفس دیکھیے۔ آج ہی نہیں۔ ابھی یہ مہینہ ہے۔ اور ہاں۔" اس نے مسز رحمان کو پلٹ کر جاتے دیکھ کر کہا۔ "اگر آج وہ آئیں، اپنے سلیم صاحب، تو اُن کو سیدھا اندر بھیج دیجیے اور کسی کو ان کی موجودگی میں اندر مت آنے دیں۔ بلکہ آج کوئی بھی آئے تو ٹال دو سلیم کے سوا۔"

اسحاق کا سارا دن انتظار میں گزرا۔ اُس کا ذہن خیالات کے انتشار سے شب بھر لڑنے والے غنیم سے مقابلہ کرنے والے سپاہی کی طرح تھکا ہوا تھا۔ فتح و شکست کے اندیشے بے معنی ہو گئے تھے اور اب محض انتظار تھا۔ جیسے میدانِ جنگ میں توپوں کی گھن گرج اور موت کی بھیانک ہنسی کے مقابلے

میں سکوت زیادہ اعصاب شکن ہوتا ہے اور خاموشی میں سکون
سے زیادہ آسیب صدا دیتے ہیں۔ اس نے جیل خانے فون
کیا جہاں سے اُسے بتایا گیا کہ چرس اور ہیروئن کے کیس میں سزا
پانے والے فلمی اداکار سلیم کو ابھی کچھ دیر پہلے رہا کر دیا گیا ہے۔
اس کا کرب اور بے چینی اس اطلاع پر یکلخت دوچند ہو گئے۔
اُس نے بند کمرے میں ٹہلتے ہوئے ایک سگریٹ سے دوسرا
سگریٹ جلایا اور ایک بار بھی نوٹ کیا کہ سگریٹ سلگاتے
وقت اُس کا ہاتھ رعشہ زدہ مریض کی طرح کانپ رہا ہے۔ چھ
مہینے کیسے چھ پل بن کے اُڑ گئے تھے اور محض پچھتاوے اور
اندیشے چھوڑ گئے تھے۔ اب کیا ہوگا؟ تیس سال کی دوستی کا
خیال ہوتا تو وہ ایک بار سلیم سے ملنے جیل ضرور جاتا۔ وہ
دوسرے درجے کا اداکار تھا جسے دو چار فلموں میں مرکزی کردار
بھی ملے تھے تو وہ فلمیں باکس آفس پر فلاپ ہو گئی تھیں اور
کوشش کے باوجود وہ ہنوز صفِ اوّل تک نہیں پہنچا تھا۔
چنانچہ اسحاق اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی انڈسٹری کے تمام پیشہ
لوگ بھی اس سے ملنے نہیں پہنچے ہوں گے اور اگر اس کے
فین تھے تو اتنی رُسوائی کے بعد سلیم اُن کی نظر میں سچ مچ
کا وِلن بن گیا ہوگا۔ اُس کے رشتے دار بہت تھے اور...
اُن سے رشتے بھی دور کے تھے۔ چنانچہ سلیم نے قیدِ بامشقت
کے یہ دن یادِ ماضی کا عذاب جھیلتے کاٹے ہوں گے۔ دوستوں
کی بے وفائی اور انسانوں کی بے مُروّتی پر افسوس کرتے
گزارے ہوں گے اور یہ سوچتے گزارتے ہوں گے کہ کسی
مستقبل کے بغیر کیا نیلم کا عہدِ وفا استوار رہے گا اور نیلم
کے بغیر مستقبل ہوا تو کیا ہوگا۔ عشق کی خوشبو اگر چھپائے نہیں
چھپتی تو کیا عجب یہ خوشبو جیل کی سنگین دیواروں سے گزر کر
سلیم تک پہنچ گئی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو آج ان کا آمنا سامنا
کس حیثیت میں ہوگا۔ مؤکل اور وکیل کی حیثیت میں؟
دوست اور رقیب کی حیثیت میں یا ایک مجرم کی حیثیت
میں، مجرم وہ دونوں تھے۔ فرق صرف جُرم کی نوعیت کا تھا۔
سلیم پر قانون نے فردِ جُرم عائد کی تھی اور وہ اپنی سزا بُھگت
چکا تھا۔ اسحاق کا جُرم اخلاقی تھا لیکن ناقابلِ معافی تھا۔ ایسے
وقت میں نیلم اُس کا سہارا بن سکتی تھی جو سلیم کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کے کہہ سکتی تھی کہ وقت بدل گیا ہے اور اُسے خود سلیم نے
اپنی عاقبت نااندیشی سے گنوایا ہے۔ وہ کسی سزا یافتہ اخلاقی
مجرم کے ساتھ ذہنی مفاہمت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی اور
اسحاق کو منتخب کر کے اس نے کسی بھی اعتبار سے نہ کوئی غلطی
کی ہے، نہ گناہ کیا ہے اور نہ جُرم۔ لیکن وہ بھی اسحاق کو بے بس و
تنہا چھوڑ کے نہ جانے کہاں گُم ہو گئی تھی چنانچہ اُس کے لیے دُہرا
عذاب تھا۔ خیالِ فرقتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ۔

شام سے رات ہوئی اور وہ اپنی خواب گاہ سے دور
رہا۔ اپنی اسٹڈی میں قانون کی کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں
کے درمیان اُس کے لیے تحفظ اور تخلیے کی ضمانت ہوتی تھی۔
یہاں زبیدہ کا داخلہ ممنوع تھا چنانچہ وہ صوفے پر نیم دراز
دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا اور اُنھیں چھت تک پہنچتے پہنچتے
تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ سلیم آفس نہیں آیا تھا لیکن وہ گھر
بھی آ سکتا تھا۔ اُس نے چوکیدار کو سمجھا دیا تھا کہ سلیم صاحب
آئیں تو اُنھیں سیدھا اسٹڈی میں پہنچا دیا جائے۔ وہ سلیم سے
علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ زبیدہ کی موجودگی میں نہیں
ورنہ یہ ممکن تھا کہ ایک جذباتی مسئلہ بڑھ کر اتنی شدت اختیار
کر لے کہ اُس کے ہاتھوں سلیم مارا جائے یا سلیم کے ہاتھوں
وہ مارا جائے۔ یا وہ زبیدہ کا گلا گھونٹ کر اُس کی آتش فشاں
زبان بند کر دے۔ کلاک نے رات کے گیارہ بجائے تو وہ چونکا۔
سلیم کے آنے کی اُمید اب ختم ہونے لگی تھی۔ اُسے رہا ہوئے
کئی گھنٹے ہو چکے اور نیلم کو غائب ہوئے پندرہ سولہ گھنٹے۔
وہ جیل سے نکل کے گیا کہاں؟ فلمی دُنیا کے دروازے
اس پر بند ہو چکے تھے اور اسحاق کے گھر کے سوا وہ
جا بھی کہاں سکتا تھا۔ کسی ہوٹل میں اُس کا جانا بعید از قیاس
تھا۔ اُسے آنا چاہیے تھا۔ ملنے نہ سہی شکایت کرنے
ہی سہی۔ زیادہ تعجب اُسے نیلم کے فرار پر تھا۔ اگر وہ اب
سلیم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی تو اُسے مجبور کون کر سکتا
تھا۔ منگنی بھی تو اُس نے اپنی ہی مرضی سے کی تھی۔ وہ خود مختار
تھی، بالغ تھی اور نہ کسی بزرگ کے سایۂ عاطفت کی محرومی
سے ڈرتی تھی اور نہ کسی اسکینڈل سے۔ وارث تھے ہی نہیں
اور اسکینڈل اُس کی شہرت کا ذریعہ بنتے تھے۔ بدنام اگر
ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

عدالتوں اور جرائم کی دُنیا سے اسحاق کا رشتہ برسوں
پرانا تھا۔ اُس نے حقیقت کا وہ رُوپ بھی دیکھا تھا جو افسانے
سے زیادہ بے بنیاد تھا اور وہ افسانے بھی دیکھے تھے جو
حقیقت بن کر سامنے آئے تھے۔ چنانچہ اُس کا ذہن امکانات
کے سلسلوں میں بھٹک رہا تھا اور اندھیروں کی یلغار میں تھا
اسے خیال آتا تھا کہ کہیں سلیم اپنے دوست اور اپنی منگیتر دونوں
کی بے وفائی سے اتنا مشتعل نہ ہو کہ رہائی کے بعد پہلے اس
نے نیلم کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا ہو۔ زیادہ قصور وار نیلم
تھی۔ اگر وہ چاہتی تو اپنے عہدِ وفا پر قائم رہ سکتی تھی اور غلط نیت

سے پیش قدمی کرنے والے اسحاق کو پہلے دن ہی بے عزت کر کے واپسی پر مجبور کر سکتی تھی۔ مرد کی نیت کا کیا ہے اگر عورت کی طرف سے مثبت جواب یا حوصلہ افزا ردِعمل نہ ملے تو وہ عاشقی کا سلسلہ کب تک ون وے ٹریفک کی طرح چلائے گا۔ دوسرا اندیشہ اسحاق کو یہ تھا کہ کہیں اچانک نیلم کے خوف نے جرم و گناہ کے احساس کی وہ شدت تو اختیار نہیں کر لی کہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ختم کرنے کے لیے زندگی کو ختم کرنے پر تل گئی ہو۔ فیصلے اگر جذباتی طوفان کی پیداوار ہوں تو اتنے ہی فوری ہوتے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ اسحاق کے خیالات کو خود اُس کا ذہن تسلیم نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اپنے دوست سلیم کی فطرت کو بھی سمجھتا تھا اور نیلم کے مزاج سے بھی واقف تھا۔ سلیم کے لیے سوچے سمجھے بغیر اور وضاحت طلب کیے بغیر نیلم کو قتل کر دینا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا نیلم کا خودکشی کی ہمت کرنا۔

رات کے آخری پہر میں جب بالآخر خواب آور گولیوں کے زیرِ اثر اسحاق کو پلک جھپکانے کا موقع ملا تو اُس نے پھر وہی خواب دیکھا جس کا اختتام اپنے ہی لہو کی اور اُس لہو کے تازہ کھدی ہوئی مٹی کی خوشبو میں شامل ہونے پر ہوتا تھا۔

"دونوں؟ وہ دونوں ایک ساتھ آئے ہیں؟" اسحاق نے بے یقینی سے پوچھا۔

"یس سر۔" مسز رحمان کی غیر جذباتی اور متوازن آواز آئی۔ انٹرکام کے بجائے اس نے ٹیلی فون لائن پر بات کی تھی۔

"سلیم کا موڈ تو ٹھیک ہے نا؟" اسحاق نے سوچ کر کہا۔ "میرا مطلب ہے بظاہر اس سے ملنے میں خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے مسز رحمان؟" وہ کہنا چاہتا تھا کہ کہیں سلیم ریوالور وغیرہ تو نہیں لے کر آیا ہے مگر زبان نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔

"نو سر۔" مسز رحمان نے یوں کہا جیسے وہ لہجے سے اسحاق کی بات کا اصل مفہوم اخذ کر چکی ہے۔

"آل رائٹ۔ ان دونوں کو اندر بھیج دو۔ اور مسز رحمان پلیز ذرا خیال رکھنا۔" اسحاق نے کہا۔ اُسے اُمید تھی کہ نیک دل اور ہمدرد مسز رحمان ہمیشہ کی طرح اُس کے دل کی بات سمجھ لے گی۔

جب وہ اندر آئے تو اسحاق نے ایک نظر میں ان دونوں کی صورتوں سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ کرنا چاہا مگر وہ بالکل نارمل تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سال بھر پہلے تھے اور ایک ساتھ اسحاق سے ملنے آتے تھے۔ نیلم میں یہ تبدیلی ناقابلِ یقین نظر آتی تھی۔ سلیم کے ساتھ بیٹھنے کے بعد وہ انتہائی پُرسکون اور پُراعتماد رہی۔ اسحاق کو اس کے رویّے میں ذرا بھی خوف یا شرمساری کا احساس نہ ہوا۔ سلیم کا نارمل نظر آنا تو سمجھ میں آتا تھا۔ شاید اُسے بعد کے حالات کی خبر ہی نہ ملی ہو مگر نیلم جو کل تک اسحاق سے اپنی جذباتی وابستگی میں دیوانگی کے قریب تھی اور جرمِ بے وفائی کے خوف سے وحشت کا شکار تھی، اب پھر پہلے کی طرح سلیم پر ملتفت تھی اور اُس کی ہر ادا میں سلیم کے لیے وہی وارفتگی تھی جو از خود اعلان کرتی تھی کہ سوائے سلیم کے وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ خواب تھا جو کچھ ہم نے دیکھا۔ جو بھی سُنا افسانہ تھا۔ اسحاق نے سوچا۔ ان گزرے ہوئے چھ مہینوں کے شب و روز کیا تھے؟ فریبِ آرزو۔ فریبِ خیال یا فریبِ نظر؟ کیونکہ نیلم کو اس سے آنکھیں چار کرتے ہوئے ذرا بھی ندامت نہ تھی۔ اُلٹا نیلم کے لبوں کی مبہم سی مسکراہٹ اسحاق کے جذبات کا تمسخر اُڑاتی محسوس ہوتی تھی۔

"تم کو صدمے نے مفلوج کر دیا ہے یا خوف نے؟" سلیم نے طنز کا پہلا تیر چلایا۔ "زبان سے کچھ تو کہو۔"

"میرے پاس کہنے کو کیا ہے؟ اور جو ہے وہ تمہارے لیے کس کام کا۔" اسحاق نے سنبھل کے کہا۔

"تمہاری خوش فہمیوں کا طلسم ٹوٹ گیا ہے نا؟" سلیم بولا۔ "اور تم اپنے شیش محل میں جو سپنا دیکھ رہے تھے، وہ شیش محل بھی سپنے کے ساتھ بکھر گیا ہے۔ تم سنگین حقائق کی چٹانوں پر زخم خوردہ پڑے ہو لیکن میں تو جیل خانے سے نکلا ہوں اور پھر بھی خوش ہوں، پُراُمید ہوں۔ تم نے تو سوچا ہو گا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہو گا۔ شاید یہ بھی سوچا ہو کہ اپنے اثر و رسوخ اور قانون کی دنیا کے تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے دوستی کا حق کیسے ادا کیا جا سکے اور ایک سال کے لیے جیل جانے والے کو ایک عمر گزرنے سے پہلے باہر آنے سے کس طرح روکا جائے۔"

"میں... میں نے ایسی کوشش کی ہوتی۔" اسحاق نے کہا۔ "تو... شاید یہی ہوتا۔ تم کبھی باہر نہ آتے۔ اندر ہی اندر تم پر نئی فردِ جرم عائد ہوتی رہتی اور تمہاری سزا کی معیاد کبھی ختم نہ ہوتی۔ بس تم کو ذہنی مریض قرار دلوا کے پاگل وارڈ بھجوا سکتا تھا...."

"اور یہ سب کچھ تم نے اس لیے نہیں کیا کہ تم کو دوستی کا پاس تھا۔" سلیم نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے مروّت اور شرافت اور انسانیت کے اعلیٰ تقاضے پیشِ نظر رکھے۔ تم ذلیل

آدمی! دوستی کے نام پر بٹہ لگانے کے لیے تم نے جو کچھ کیا اُس کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ جب تم عیش کر رہے تھے تو میں جیل کی کوٹھری کے پتھریلے، سرد اور بے رحم فرش پر لیٹا خود کو صبر کی تلقین کر رہا تھا اور یہ حوصلہ دے رہا تھا کہ سختیٔ ایام کے دن تھوڑے ہیں۔ یہ سزا کاٹ کے نکلوں گا تو احساسِ جرم و گناہ میرے ساتھ نہیں ہوگا اور میں پرانے سہاروں کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرسکوں گا۔ کتنا بڑا دھوکا دے رہا تھا میں خود کو۔ تم بھی مجھے دھوکا دے رہے تھے، بزدل اور بے ضمیر آدمی۔ اب کفارہ ادا کرنے کا وقت آیا ہے تو تمہاری حالت غیر ہو رہی ہے۔ میری طرح اپنے جرم کی سزا کاٹنے کا حوصلہ کیوں نہیں ہے تم میں؟"

"دیکھو سلیم، قصوروار صرف مجھے مت سمجھو۔" اسحاق نے تھوک نگل کے خشک حلق کو تر کیا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔" سلیم بولا۔ "اگر اس معاملے کی تشہیر ہوئی تو دُنیا نیلم پر انگشت نمائی کرے گی لیکن دنیا تو پہلے بھی نیلم پر انگلیاں اُٹھاتی رہی ہے۔ انگلیاں ہی کیا اٹھاتی رہی ہے سنگِ دشنام سے بھی نوازتی رہی ہے لیکن اب تک ان میں تم جیسے عزت کے ٹھیکیداروں کا نام نہیں آیا تھا۔ تم تو دستگیری کرنے والوں میں شامل تھے، دست درازی۔۔۔"

"کیا تم اس معاملے کو اُچھالنا چاہتے ہو؟" اسحاق نے کہا۔

"میں تم کو معاف کرنا نہیں چاہتا۔" سلیم نے کہا۔ "چنانچہ مجھے کسی رائی کا پہاڑ بنانے والے وکیل سے مشورہ کرنا ہوگا اور بات کا بتنگڑ بنانے والے صحافی کو رشوت دینی ہوگی۔ فلمی دنیا کے مراسم میرے کام آئیں گے اور مس نیلم کے لیے ایک چھوٹی موٹی پریس کانفرنس کا بندوبست مشکل نہیں ہوگا جس میں سنسنی خیز سرخیاں لگانے والے صحافیوں کو دلچسپ تفصیلات فراہم کی جائیں گی۔ نیلم اداکاری اچھی کر لیتی ہے۔ وہ رو رو کر بتائے گی کہ کس طرح سلیم صاحب کو جیل بھجوانے کے بعد ایڈووکیٹ زاہد اسحاق بار ایٹ لا نے اس کو گمراہ کیا۔ یعنی ورغلایا۔ اور غلط مواقع سے فائدہ اٹھا کے اُسے غلط راہ پر چلنے پر مجبور کردیا۔ وہ بتائے گی کہ ناگزیر مالی مشکلات کے باعث وہ سلیم کے سب سے قریبی اور مخلص دوست اسحاق سے مدد لینے گئی تھی بظاہر فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت نظر آنے والے اسحاق نے انسانی ہمدردی، خلوص اور دوستی کی بنیاد پر مسئلہ تو حل کر دیا لیکن نیلم کو ان کا حقِ دوستی کا یہ مظاہرہ بہت مہنگا پڑا۔ اسحاق صاحب دولت مند اور با اثر آدمی تھے چنانچہ انھوں نے دوستی کا خون کیا۔ شرافت اور انسانیت کا لبادہ چاک کیا اور نیلم کو کس طرح اُن کے احسانات کا بدلہ چکانا پڑا۔۔۔"

"تم کچھ ثابت نہیں کرسکتے۔" اسحاق نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ تپ رہا ہے۔

سلیم ہنسا۔ "یہ ثبوت کیا کم ہوگا کہ نیلم خود اپنی بے آبروئی کی داستان بیان کرے گی۔ اپنی مظلومیت کا افسانہ سناتے ہوئے زار و قطار روئے گی اور اخبار نویس بہرحال مرد ہوتے ہیں۔ کسی خوب صورت عورت کے آنسو ان کو بھی پگھلا دیتے ہیں اور وہ ان ہی اشکوں کی گواہی قبول کرتے ہوئے جھوٹ کو سچ مان لیتے ہیں لیکن تم وکیل ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نیلم مجھ سے جیل میں ملنے آتی رہی تھی۔ اُس نے جیل کے اندر گواہوں کی موجودگی میں تمہاری ہر زیادتی کی تفصیل فراہم کی تھی اور یہ سب کچھ اُس نے میری ہدایات اور میرے مشورے کے مطابق کیا تھا۔ اس ڈرامے کا ہدایت کار میں تھا۔ تم انکار کیسے کروگے؟"

"تم۔۔۔ تم دونوں نے مل کر۔۔۔ سازش کی تھی میرے خلاف!" اسحاق نے غصے کی منہ زور لہر کو ایک بار پھر روک لیا۔

"وکیل صاحب! نیلم کی عزت گیا اور آبرو گیا۔" سلیم نے کہا۔ "میں خود بے آبرو ہوچکا۔ جیل سے سزا کاٹ کر نکلنے والے کو عزت خیرات میں بھی نہیں ملتی۔ میرے لیے وہ دنیا اجنبی ہوگئی ہے جس میں ہر نووارد ندیم اور محمد علی بننے کے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے آتا ہے۔ لیکن تم اب بھی اس دنیا میں ہو جہاں بار ایسوسی ایشن کا صدر اور پھر صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے خواب تمہاری دسترس میں ہیں۔ تم وزارت کے اُمیدوار کہلاتے ہو اور لوگ سمجھتے ہیں کہ تم اس اعزاز کے مستحق ہو، اپنی صلاحیت اور اپنی نیک نامی کی بنیاد پر۔ قیمت کس کی زیادہ ہے؟ صلاحیت کی یا نیک نامی کی؟"

اسحاق نے اب اشتعال کے آتش فشاں کو سرد کر دیا تھا۔ اس نے دراز میں سے شیشی نکال کے ویلیم کی دو گولیاں پانی کے ساتھ نگلیں اور اگرچہ اُن کا اثر بیس منٹ سے پہلے ظاہر نہیں ہوسکتا تھا مگر نفسیاتی طور پر اُس نے خود کو سوچنے سمجھنے کی بہتر پوزیشن میں محسوس کیا۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ نیلم کی چاہت اور اس کی والہانہ خود سپردگی مکڑی کا جالا ہے اور تریا چلتر ہے۔ ہر شب کا حلقۂ دام اسے اپنی خواہشات کا اسیر بناتا رہا اور نیلم اپنی قوتِ تسخیر پر نازاں اپنی بے غیرتی اور اس کی بیوقوفی پر خندہ زن رہی۔

"میں سمجھنے لگا ہوں دوست کہ تم کیا چاہتے ہو۔" اسحاق نے سگار جلا کے ایک گہرا کش لیا۔ "انگریزی محاورے کے مطابق

تم یہ مجھے میرے ہی سکوں سے ادائیگی کرنا چاہتے ہو اور یہ پُرفریب دوستی کے جعلی سکے ہیں لیکن تم نے اپنی مستقبل کی زوجۂ محترمہ کے ساتھ یہ جال پھیلانے سے پہلے غور نہیں کیا کہ شکار کون ہے؟ تم نے رضاکارانہ طور پر عدالت میں اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرلیا تھا۔ تمہارے خلاف دعویٰ کرنے والے سات افراد تھے جنھوں نے دستاویزی ثبوت کے طور پر اپنے بل اور تمہارے بوگس چیک پیش کیے تھے۔ تم ان سے سامان لیتے گئے اور ان کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے چیک کاٹتے گئے حالانکہ تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے یہ چیک آنر نہیں ہوئے۔ میں نے اور تمہارے دوستوں اور چند مدّاحوں نے دوڑ دھوپ کر کے اتنی رقم جمع کر لی کہ ہر مدّعی کو ادائیگی ہوسکے۔ کچھ مدّعی جزوی رقم پر بھی تمھیں معاف کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ کیس یقیناً ختم ہوجاتا مگر اس سے پہلے ہی تم نے راتوں رات ایک لاکھ کمالینے کی کوشش کی۔ تم ان کے آلۂ کار بن گئے جو مجبور شخص کی مجبوری کا سودا اسی طرح کرتے ہیں۔ تمہارے قبضے سے دس دس گرام ہیروئن کی دس پڑیاں اور چرس کے دس ٹکڑے برآمد ہوئے۔"

"میں جانتا ہوں، مجھے آسمان سے گرا کے کھجور میں اٹکانے والے بھی تم تھے۔" سلیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم پولیس سے ہر کام لے سکتے تھے چنانچہ تم نے یہ نیک کام کیا کہ مجھے ایک چھوٹے جرم سے چھڑانے کی کوشش بھی جاری رکھی اور اس سے بڑے جرم میں ملوّث کرانے کی کوشش بھی۔"

"تمہارا پہلا جرم بھی کم سنگین نہیں تھا۔" اسحاق نے کہا۔ "تم کو تین سال سے سات سال تک کی سزا ہوسکتی تھی۔ رہا تمہارا یہ مفروضہ کہ میں نے ہی تمہارے خلاف دوسری فردِ جرم بنائی۔"

"یہ مفروضہ نہیں ہے، میرا یقین ہے۔" سلیم نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایک فنکار، ایک دوست اور ایک انسان کو بچانے کے لیے تم نے چندہ اکٹھا کرنے کی جو مہم چلائی تھی اس میں تم نے کتنا کمایا۔"

"کمایا؟ میں نے گزشتہ چھ ماہ میں اپنی چھ سال کی کمائی گنوا دی ہے، اس فاحشہ پر۔"

"یہ تمہاری عقل کا فتور تھا۔ میں صرف اس پیسے کی بات کررہا ہوں جو تم نے میرا قرض چکانے کے لیے جمع کیا تھا۔" سلیم نے میز پر ہاتھ مار کے کہا۔ "اس کا حساب چاہیے مجھے اور باقی رقم بھی۔"

"کل رقم ایک لاکھ پانچ ہزار روپے تھی۔" اسحاق نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بیشتر قرض خواہوں کو ان کا پیسہ مل گیا۔ کچھ قرض معاف ہوا، چنانچہ تم چاہو تو پینتیس ہزار لے سکتے ہو۔ ستّر ہزار میں نے کس کس کو دیے، اس کی تفصیل میرے پاس ہے اور تم ان سے تصدیق کرسکتے ہو۔"

"یہ تصدیق کون کرے گا کہ تمھیں پورے ایک لاکھ پانچ ہزار ہی ملے تھے؟" سلیم مسکرایا۔ "ہر مدد کرنے والے کو رسید دی تھی تم نے؟ اور کیا گمنام رہ کے مدد کرنے والے اب تصدیق کے لیے سامنے آئیں گے؟ سیدھی صاف بات یہ ہے اسحاق کہ میں سودا کرنے آیا ہوں۔ جیو اور جینے دو کا فلسفہ ہی سب سے زیادہ قابلِ عمل اور ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔ مجھے زندہ رہنے اور نئی زندگی کے آغاز کے لیے ٹھوس ضمانت چاہیے۔ تم کو اپنی نیک نامی کے تحفّظ کی ضمانت درکار ہے تاکہ تم بار کے صدر، ایم پی اے اور وزیر بننے کی جدوجہد جاری رکھو۔ میں دونوں ضمانتوں کو ایک لاکھ سکّۂ رائج الوقت میں منظور کرسکتا ہوں۔ مدّعی میں ہوں اور منصف بھی میں ہوں۔ ہر کیس میں پچاس ہزار کی ضمانت زیادہ نہیں مانگ رہا ہوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" اسحاق نے بگڑ کے کہا۔ "میرے بنک اکاؤنٹ میں اس سے نصف رقم بھی نہیں۔"

"کیا یہ بات کوئی تسلیم کرے گا؟ تم اتنے بڑے اور کامیاب وکیل ہو۔"

"میں ایک کامیاب وکیل تھا۔" اسحاق نے برہمی سے کہا۔ "لیکن چھ ماہ قبل۔ اس زہریلی ناگن نے کس طرح مجھے ڈسا ہے، یہ تم اسی سے پوچھ سکتے ہو۔"

"یہ بیچارہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے سلیم۔" نیلم نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "پریکٹس تو برائے نام ہی رہ گئی ہے اس کی، جیسے فلمی دنیا میں ہمارا کام برائے نام رہ گیا تھا۔ اس غریب کو تھوڑی سی رعایت دے دو، یہ نہ ہو کہ پینتیس ہزار بھی جائیں۔ یہ رات کو کچھ کھا کے سو جائے۔"

شدید نفرت اور غصّے میں نیلم اسے ایک مکروہ صورت طوائف کی سطح سے بھی بہت گری ہوئی عورت لگی۔ حالانکہ یہی عورت تھی جس کے عشق کی وارفتگی نے اسے دنیا و عقبیٰ کی فکر سے بیگانہ کر کے اس حال کو پہنچا دیا تھا جہاں اپنے تو اپنے، غیر بھی اس پر افسوس کرتے تھے۔ بیچارا اور غریب کہہ کے اس نے اسحاق کی عزتِ نفس پر وار کیا تھا اور اسے اپنی ہی نظر سے گرانا چاہا تھا لیکن خود اپنے کیے پر اسے جھوٹی ندامت تک نہ تھی۔ ایک دن اور ایک رات کے فرق سے سیاہ و سفید کا فرق اسحاق کے سامنے آگیا تھا لیکن اس کا ذہن ابھی تک بے یقینی کے سراب سے چھٹکارا نہیں پاسکا تھا اور جو نقش نیلم نے چھ ماہ تک اظہارِ محبت

سے قائم کیا تھا وہ مٹائے نہ مٹتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ نیلم کو نہیں اور تھی یا نیلم یہی تھی تو مذاق کر رہی ہے اور اس کا دوست بھی اس کو تھوڑی سی ذہنی کوفت میں مبتلا کر رہا ہے تو یہ بھی ڈراما ہے۔ ابھی وہ اٹھ کے اس کی کمر پہ ایک مکا مارے گا اور کہے گا سالے! نیلم نے تجھے منتخب کر لیا ہے تو وہ نیلم کی مرضی۔ مجھ میں اور تجھ میں فرق ہی کیا ہے۔ اپنی دوستی اس سے الگ ہے اور تیس سال کی بنیادیں بہت گہری چلی گئی ہیں مگر دوستی کا وجود ہی کہاں رہا تھا۔ سب سے پہلے تو خود اسحاق نے دوستی کی بنیادوں کو کھود ڈالا تھا۔ پھر سلیم نے وہی کیا تھا جو سلیم نے کہا تھا اور اس نے بھی دوستی کی دیوار گرا کر دشمنی کی خندق کھودی تھی۔ اب مذاق کی کون سی گنجائش ہے۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے تو سلیم اور نیلم کی ہر بات جائز ہے۔

”مگر پینتیس ہزار... یہ تو ہماری ضرورت کے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں ہیں ڈارلنگ!“ سلیم نے کہا۔ ”تمہاری خاطر میں اتنی رعایت کر دیتا ہوں کہ اسحاق ابھی مجھے صرف پچاس ہزار ادا کر دے۔ بولو منظور ہے تمھیں؟“

”ٹھیک ہے۔ میں تم دونوں کی انسانیت، رحم دلی، دوست نوازی کا شکر گزار ہوں۔“ اسحاق نے دل ہی دل میں ان دونوں کو فحش ترین گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب سودا ہو رہا ہے تو میں بھی اپنا حساب بتا دوں۔ میں نے تمھارا مقدمہ لڑنے کی فیس نہیں لی تھی۔ وہ دس ہزار تم کو بھی دینے ہوں گے۔“

”ہے تو یہ اصول کی بات۔“ سلیم نے تائید طلب نظروں سے نیلم کو دیکھا۔ ”مگر ہمارا تو سارا معاملہ ہی بے اصولی کا ہے۔“

اسحاق نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ ”مسز رحمان پلیز، بینک مینیجر کو فون کر دیجیے۔ میں بات کر دوں گا اس سے۔ مجھے اپنے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار نکلوانے ہیں۔ شاید او ڈی لینا پڑے۔“

”آپ چیک دے دیں سر۔“ مسز رحمان نے کہا۔ ”میں پچاس ہزار لے آتی ہوں۔“

”آپ خود جائیں گی بینک؟“ اسحاق نے کہا۔

”بینک جانے کے لیے صرف سڑک ہی تو پار کرنا پڑتی ہے سر۔“ مسز رحمان نے کہا۔

جب وہ چیک لینے اندر آگئی تو اس نے اسحاق کی اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں پرانے مہمانوں کی صورت دیکھی۔ وہ سب چپ تھے اور کشیدگی کے احساس سے فضا بوجھل تھی۔ اسحاق نے ان کے لیے نہ چائے منگوائی تھی اور نہ کافی، چنانچہ معاملہ گڑبڑ تھا۔ غالباً پچاس ہزار اسی گڑبڑ کو ٹھیک کرنے کا معاوضہ تھا۔ مسز رحمان نے طے کیا، وہ ایک فرض شناس سیکریٹری ہی نہیں، مخلص ساتھی بھی تھی، چنانچہ اسحاق کی حالت پر اس کا دل بھی دکھتا تھا۔ صرف ایک عورت کی خاطر اسحاق نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اچھا خاصا ذہین اور تجربہ کار، عاقل و بالغ اور معاملہ فہم شخص تھا چنانچہ اسے بدنصیبی کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی حد میں رہ کر اسحاق کی مدد ضرور کر سکتی تھی۔ ناصح بن کر اسے لیکچر نہیں دے سکتی تھی اور اس کی گارجین بن کے اس کے اطوار درست نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ باس کون ہے اور ماتحت کون اور ان کے درمیان کتنا فاصلہ رہنا چاہیے۔

”چلو، یہ مسئلہ تو طے ہو گیا۔“ سلیم نے ہاتھ ملا کر خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ ”اب ایک اور سوال ہے تم سے وکیل صاحب! فرض کرو میں عدالت کے روبرو اپنے مالی حالات کی ابتری کو تسلیم کر لیتا۔ یہ درخواست کرتا کہ مجھے دیوالیہ قرار دیا جائے یا میں قرض کی ادائیگی کے لیے مہلت اور رعایت مانگ لیتا۔ تم میرے ضامن بن سکتے تھے۔ میرے پاس تھا ہی کیا جو عدالت ضبط کر کے نیلام کا حکم دیتی۔ ایک لاکھ پانچ ہزار میں سے دس پندرہ ہزار وصول ہوتے۔ باقی رقم ادا نہ کرنے پر مجھے کتنی سزا ہوتی، یہی سال دو سال۔ ایک سال تو میں کاٹ آیا ہوں، دو سال بھی گزر ہی جاتے۔ پھر تمھیں کیا پڑی تھی میرے قرض خواہوں کو ادائیگی کرنے کی؟ تم وہ رقم جمع رکھتے تو آج میرے کام آتی۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جیل سے نکل کر میں واپس فلموں میں تو جانے سے رہا۔ مجھے گزر اوقات کے لیے کسی ذریعۂ معاش کی ضرورت ہوگی۔ وہ رقم میں کاروبار میں لگاتا تو کچھ نہ کچھ کما لیتا۔ بزنس میں نے کبھی کیا تو نہیں تھا لیکن مجھ میں سمجھ بوجھ ضرور ہے۔“

”تم میں بزنس کرنے کی سمجھ بوجھ ضرورت سے زیادہ ہے۔“ اسحاق نے طنز سے کہا۔

”تم نے غلطی کی کہ میرا قرض ادا کر دیا۔ وہ پیسہ جو میرے لیے جمع کیا گیا تھا، بہتر طور پر یوں میرے کام آتا کہ مجھے مل جاتا۔ وہ سب جو مدعی بنے تھے، بڑے بڑے کاروباری لوگ تھے۔ ان لوگوں کو اپنے بیس بیس پچیس پچیس ہزار نہ ملتے تو وہ غریب نہ ہوتے، انھوں نے تو ضد میں انتقامی کارروائی کی تھی۔ کچھ پبلسٹی کے لیے بھی کہ فلاں بزنس مین نے فلم اسٹار سلیم اعجاز کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور میرے ساتھ اس کا بھی نام آتا۔“ سلیم ذرا سی دیر کے لیے رکا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ ستر ہزار بھی تم مجھے ادا کر دو۔“

”ڈارلنگ!“ نیلم نے ایک ادا سے مسکرا کے کہا۔ ”کیوں پریشان کرتے ہو اپنے دوست کو۔ بس ہو گیا سودا۔“

”اوکے، تم کہتی ہو تو بخش دیتا ہوں۔“ سلیم بولا۔

"تم دونوں ذلیل، بلیک میلرز" یکلخت اسحاق کا حوصلہ جواب دے گیا "گیٹ آؤٹ" مگر اسی وقت مسز رحمان نے بے آواز دروازہ کھول کے اندر قدم رکھا۔

"یہ پورے پچاس ہزار ہیں سر!" اس نے رقم اسحاق کے سامنے میز پر رکھ دی۔ اسحاق نے رقم سلیم کی طرف کھسکا دی۔

"تھینک یو مسز رحمان! آپ کو زحمت ہوئی" اسحاق نے کہا لیکن مسز رحمان اس کی بات سننے سے پہلے ہی پلٹ چکی تھی۔

"ہنگامہ کرو گے تو نقصان اپنا ہی کرو گے" سلیم نے کہا۔ "مسز رحمان پھر اندر آجائے گی"

"اور مسز رحمان اچھی عورت ہے، تمھیں بھی اچھا سمجھتی ہے" نیلم نے کہا اور رقم کو اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا۔

"ہاں۔ لیکن وہ تم کو کیا سمجھتی ہے کبھی اس سے پوچھ کر دیکھنا" اسحاق نے نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "میں نے اپنی بے وقوفی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے یا معاملے کو تمھاری مرضی کے مطابق ختم کرنے کے لیے پچاس ہزار دینے قبول کر لیے ہیں تو یہ مت سمجھو کہ تم.... مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو اور آئندہ بھی کر سکو گے۔ میں بہرحال ایک بہت بڑا وکیل ہوں اور قانون کو دونوں طرح سے استعمال کرنا جانتا ہوں۔ اپنے دفاع میں بھی اور اپنی طاقت بنا کے بھی"

"مجھے مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو اسحاق!" سلیم نے تیز لہجے میں کہا "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تمھارا یہ قانون کیا ہے اور تم کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ تم ہم پر بلیک میلنگ کا الزام عائد کر دو گے۔ جیل بھجوا دو گے ہمیں کسی مجسٹریٹ پر ناجائز دباؤ ڈال کے۔ لیکن اپنے مستقبل کی سوچو۔ جب تمھارے خلاف عدالت میں ثبوت پیش کیے جائیں گے تو تمھارے کردار کا دوسرا رخ پبلک کے سامنے آئے گا۔ سننے والے تمھارے ساتھی وکیل بھی ہوں گے، پریس والے بھی اور تمھارے دوست دشمن بھی اور ہمارے پاس زبانی ہی نہیں، دستاویزی ثبوت بھی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد تمھارے اخلاق و کردار کا محاسبہ ضرور ہوگا۔ ممکن ہے تمھیں بار کونسل کی انتظامی کمیٹی کے روبرو پیش ہونا پڑے۔ کیا کہو گے تم... اپنی صفائی میں جب وہ تمھیں تمھاری ہی صورت کا عکس دکھا دیں گے؟ اپنی تصویر کو پہچاننے سے انکار کر سکو گے تم؟ ہر آئینے کو جھوٹا کہہ سکو گے؟ یہ ہو سکتا ہے بیرسٹر صاحب! کہ آپ کا لائسنس منسوخ ہو جائے۔ تم نے بہت سوچا ہوگا کہ آخر نیلم چابی چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئی اور تمھارے سارے مخالف وہاں کیوں چھوڑ آئی۔ تمھارے خلاف ایک ثبوت وہ فلیٹ ہے جس میں تم خالد محمود کسٹم آفیسر کی حیثیت سے رہے اور نیلم کو اپنی بیوی عالیہ بتاتے رہے۔ پہلا کیس جعلسازی سے نقلی کسٹم افسر بن کر۔ دھوکے اور غلط بیانی سے کرائے پر فلیٹ حاصل کرنے کا۔ دوسرا ایک عورت کو اپنی بیوی ظاہر کرنے کا۔ یہ کیس حدود آرڈیننس کے تحت بھی آتا ہے۔ تمھارے خلاف دونوں گواہ بہت اہم ہوں گے۔ ایک فلیٹ کا مالک اور دوسرا وہاں کا چوکیدار۔ اپنے ضابطہ فوجداری وغیرہ کی مختلف دفعات کے تحت اپنی سزا کا تعین تو کرو" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "نہیں کر سکتے تو مجھے ایک لاکھ اور دے دو"

اسحاق مفلوج اور بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ نیلم نے اس کو ہر بات بتا دی تھی اور اس کے گرد اتنا مضبوط شکنجہ کس دیا تھا کہ وہ دم نہیں مار سکتا تھا۔ وہ کیا بتاتا کہ آج ہی اس نے اپنے خلاف ایک اور گواہ بھی پیدا کر لیا ہے۔ کریم سینٹر کا عبدالکریم جو اسی فلیٹ کے اوپر والے فلیٹ میں مقیم ہے۔ معلوم نہیں چوکیدار نے اسے کیا بتایا ہوگا اور وہ دونوں کس نتیجے پر پہنچے ہوں گے۔ اس کا اعتماد متزلزل ہو رہا تھا۔ سلیم کی دھمکی نظرانداز کرنے کے نتائج اس سے کہیں زیادہ سنگین نکل سکتے تھے، جن کا ذکر سلیم نے کیا تھا لیکن وہ اتنی آسانی سے شکست تسلیم کرنے پر اب بھی تیار نہ تھا۔ اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا دشمن کو شہزوری کے مظاہرے پر اکسانے کے مترادف تھا۔ اس وقت ذہن کی ساری صلاحیت بے مصرف ہو گئی تھی۔ اسے مہلت درکار تھی تاکہ وہ کچھ سوچ سکے۔ اس کے ترکش میں بہت تیر تھے اور قانون سے زیادہ اس کا وہ تجربہ اس کے ساتھ تھا جو مجرموں کے ذہن کا اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوا تھا۔ وہ لوہے کو لوہے سے کاٹنا جانتا تھا لیکن یہ کام استقامت، صبر اور سکون کا طالب تھا۔

"ایک لاکھ بہت ہوتے ہیں" اسحاق نے شکست خوردہ لہجہ بنا کے کہا "مجھے کچھ مہلت تو دو"

"مہلت کس لیے؟ کیا تمھیں اپنی نام نہاد شریک حیات کی اجازت مطلوب ہے؟" سلیم ہنسا "اس سے بھلائی کی توقع مت رکھو وکیل صاحب! جس کے ساتھ تم نے کبھی بھول کے بھی بھلائی نہ کی ہو۔ زبیدہ کہنے کو تمھاری قانونی بیوی ہے، لیکن تم اسے کیا سمجھتے ہو۔ شاید ایک پالتو جانور کی ضرورت اور اہمیت بھی اس سے زیادہ ہوتی ہے"

"ہاں، نیلم کو میں نے اس سے کہیں زیادہ اہمیت دی تھی، حالانکہ وہ زبیدہ کی خاکِ پا بھی نہیں"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ زبیدہ کل بھی تمھارے لیے اتنی ہی غیر اہم رہے گی" سلیم نے کہا "کیونکہ وہ عورت نہیں ہے،

ایک جیتی جاگتی عورت ہے جس کے دل کی جگہ تجوری کا تالا ہے اور اس تجوری میں جذبات نہیں ہیں، نہ محبت کے نہ نفرت کے۔ صرف تمہاری دولت ہے۔ کیا میں جانتا نہیں کہ وہ زبردستی تمہارے گھر میں گھسی ہوئی ہے اور ربڑ بن کے تم سے چمٹ گئی ہے کیونکہ محبت کے نام پر تم نے اس کی ساری دولت ہتھیا کر اپنے نام کر لی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے دلکش چہرے کے پیچھے کسی شیطان کا مکروہ چہرہ ہے۔ جب سے حقیقت عیاں ہوئی ہے، وہ تم کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اب تم اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن وہ تم کو چھوڑ کے تو خود کہاں جائے؟ اس کا سب کچھ تو تم لے چکے۔ دُنیا اور دُنیا کا قانون اسے تمہاری بیوی تسلیم کرتا ہے اور وہ تم کو کسی طرح بھی یہ موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی کہ تم اسے طلاق دے سکو۔ اس نے تمہارا ہر ظلم برداشت کیا، تشدّد سہا، تمہاری غلامی قبول کی۔ کبھی منہ سے نہیں کہا کہ تم پیتے کیوں ہو اور باہر کس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہو؟ تمہاری بے حیائی کی حد یہ تھی کہ تم بدقماش عورتوں کو اسی گھر میں لے جاتے رہے مگر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے تم کو صاف بتا دیا ہے کہ تم اسے قتل تو کر سکتے ہو مگر نہ اسے طلاق دے سکتے ہو اور نہ اس سے دوسری شادی کی اجازت حاصل کر سکتے ہو۔ وہ تمہاری مدد نہیں کر سکے گی وکیل صاحب!"

"وکیل صاحب کو اپنی بے پناہ عقل پر بھروسا ہے۔" نیلم نے شوخی سے کہا۔ "ان کو یقین ہے کہ تھوڑا سا وقت مل جائے تو ان کا شاطر ذہن کوئی صورت نکال لے گا جس سے ہمیں مات ہو جائے۔"

"حالانکہ مات وکیل صاحب کو ہو چکی ہے۔" سلیم بولا۔ "اس فلیٹ میں جو خالد محمود کسٹم آفیسر نے لیا تھا، ایک اخبار والا ہر روز آتا تھا۔ ایک دودھ والا بھی آتا تھا اور وہ ضرورت پڑنے پر زاہد اسحاق ایڈووکیٹ بار ایٹ لاء کو آسانی سے پہچان لیں گے کہ یہی خالد محمود صاحب ہیں اور اس وقت تم عدالت میں کہاں کھڑے ہو گے؟"

اسحاق کا سر گھومنے لگا۔ نیلم نے پورا اعتماد حاصل کر کے اسے ذلت و رسوائی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا اور اب اپنے منگیتر کو لے آئی تھی کہ ہاتھ بڑھاؤ اور وکیل صاحب کی مدد کرو مگر ہاتھ بڑھانے کا معاوضہ ایک لاکھ الگ ہو گا۔ مدد کے لیے سلیم کو بلانے کا نقد پچاس ہزار وہ پہلے ہی حاصل کر چکی تھی۔ خود کردہ علاجِ نیست...... یہ سارا کھیل ہی دھوکے کا تھا۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہوتا کہ نیلم کی محبت محض اداکاری ہے تو وہ سنبھل جاتا۔ اس نے بہت سی فاش غلطیاں کی تھیں اور ان میں سب سے بڑی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ اداکاری اور محبت میں فرق کو نہیں سمجھ سکا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ نیلم ایک اداکارہ ہے۔

"کیا یہ ممکن ہے سلیم صاحب کہ میں انکار کر دوں؟" اسحاق نے کہا۔ "اپنے لیے بدنامی قبول کر لوں مگر تم کو بھی دیوارِ زنداں کے پیچھے پہنچا دوں۔ تم پہلے ہی سزا یافتہ ہو۔"

"یہی تو اصل فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ مجھے دوبارہ جیل جانے سے کیا فرق پڑے گا اور نیلم سے تم جیسے کسی عزت دار نے شادی نہ کی تو اسے کیا فرق پڑے گا۔ جیل سے باہر نکلتے ہی میں اس سے شادی کر لوں گا۔" سلیم نے کہا۔ "تم یہ حوصلہ ہے اپنے مستقبل کو خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے کا؟ اور وہ بھی صرف ایک لاکھ کی خاطر۔ اس وقت تم ہوش کے بجائے جوش سے کام لے رہے ہو۔ اپنے خوابوں کو خواہشوں کو صرف ایک لاکھ کے لیے قتل کرنا چاہتے ہو، حالانکہ یہ ایک لاکھ تم ایک مہینے میں کما سکو گے۔ ترقی کے راستے تم پر بند نہیں ہوئے ہیں۔"

"لیکن جس شخص کے پاس ایک لاکھ نہ ہوں، وہ اپنے مستقبل کی امیدوں کا خون کرنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔" اسحاق نے کہا۔ "مایوسی کی آخری انتہا کو پہنچ جانے والا شخص کسی کا بھی خون کر سکتا ہے، اپنا یا دوسروں کا۔"

"تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ آج تمہارے پاس ایک لاکھ بھی نہیں رہے۔" سلیم نے کہا۔

"ہاں۔ میرے پاس پہلے بہت کچھ تھا مگر اب نہیں ہے۔" اسحاق نے سلیم کی طرف نفرت سے دیکھا۔ "جو کچھ میں نے کمایا تھا وہ بھی نہیں ہے اور اس کی ذمے دار یہ عورت ہے۔ اس کی خاطر روپیہ پیسہ ہی نہیں، میں نے اپنی پریکٹس بھی قربان کر دی۔ میرے ماتحت وکیل مجھے چھوڑ گئے کیونکہ میں ان کو معاوضہ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسٹاف کو برطرف کر دیا۔ صرف مسز رحمان رہ گئی ہے جو وضعداری نبھا رہی ہے اور میں اسے برطرف کر بھی نہیں سکتا۔ میں نے بڑا دفتر اس لیے چھوڑا کہ تین مہینے سے میں نے اس کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ قصرِ زبیدہ کا پراپرٹی ٹیکس اور سب واجبات اتنے تھے کہ مجھے اپنی گلبرگ کی کوٹھی ساڑھے چار لاکھ میں بیچنی پڑی۔ ثبوت چاہیے ہو تو اس کرائے دار سے جا کر پوچھ لو جو اب کوٹھی کا مالک ہے۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔" سلیم نے کہا۔ "وہ ساڑھے چار لاکھ ختم تو نہیں ہوئے ہوں گے۔"

"یہ آخری پچاس ہزار تھے جو میں نے تم کو دے دیے، اب کیا ہے میرے پاس۔"

"ابھی قصرِ زبیدہ ہے۔" سلیم بولا۔ "اس کی قیمت پانچ لاکھ تو ہو گی۔ تمہاری گاڑی اور دوسرا اسباب ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو، میں فٹ پاتھ پر میز کرسی ڈال کے بیٹھ جاؤں؟"
اسحاق نے دہاڑ کر کہا۔ "ناٹری پبلک اور اوتھ کمشنر کی مہریں لے کر اور قصر زبیدہ کیا میرا ہے؟"

"تمھاری نصف بہتر کا تو ہے۔" سلیم مسکرایا۔ "آڑے وقت میں بیویاں بھی مدد کرتی ہیں۔"

"ابھی تم نے ہی کہا تھا کہ وہ میری نام نہاد بیوی ہے۔"

"دیکھو، اسے قائل کرو۔ یہ سمجھاؤ کہ ایک لاکھ کچھ نہیں۔ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ ویسے تو شاید اسے پہلے ہی سب معلوم ہو گا۔ پھر اس سے کہو کہ عزت اور نیک نامی سے بڑھ کر تمھارے لیے کچھ نہیں۔ اگر ایک لاکھ دے کر تم تباہی سے بچ جاؤ تو پھر محنت کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہو، ایک کی جگہ دس لاکھ کما سکتے ہو۔ اسے سبز باغ دکھاؤ کہ جب وہ بار ایسوسی ایشن کے صدر کی بیوی ہو گی تو کتنے ٹھاٹھ سے رہے گی۔ جب ایم پی اے کی بیوی ہو گی تو لاکھوں میں کھیلے گی اور محلوں میں رہے گی، اسے اور کچھ نہیں چاہیے۔ تمھاری ضرورت بھی وہ اس لیے محسوس کرتی ہے کہ تم اس کے لیے عیش کی زندگی کا ذریعہ ہو۔ تم وہ پیسہ کمانے والی مشین ہو جس سے وہ زندگی کی راحت کا سامان حاصل کرتی ہے، وہ تم کو ضائع نہیں ہونے دے گی۔ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی مرنے لگے یا نیلام ہونے لگے تو عیش و عشرت سے محرومی کا آسیب ڈرانے لگتا ہے۔ زبیدہ تمھیں ایک لاکھ کیا، دو لاکھ حاصل کرنے کا موقع دے گی تاکہ اسے تمھارا تحفظ اور تمھارے گھر کی پُرآسائش زندگی حاصل رہے۔ نہ وہ مرنا چاہتی ہے اور نہ تمھیں چھوڑ کر در بدر ہونا چاہتی ہے۔ وہ ضرور مدد کرے گی۔"

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا لیکن تم مجھے مہلت تو دو گے نا؟" اسحاق نے سوچ کر کہا۔

"ہاں۔ ابھی تو یہ پچاس ہزار چلیں گے۔" سلیم نے کہا۔ "لیکن باقی ایک لاکھ کے لیے میں تم کو دو ماہ کی مہلت دے سکتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔" اسحاق نے کہا۔ "آج ستمبر کی ستائیس تاریخ ہے۔ تم یکم دسمبر کو آجاؤ۔"

"اور میں؟" نیلم نے اچانک کہا۔ "میں کب آؤں؟"

"کیا تم کو سلیم کے ساتھ آنا منظور نہیں؟ اس وقت تک کوئی اور ہو گا؟"

"جی نہیں وکیل صاحب! یہ سودا تو آپ نے سلیم سے کیا ہے۔" نیلم بولی۔ "اتنا ہی مجھے بھی تو ملنا چاہیے۔ اصل قیمت تو میری خاموشی کی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ سلیم صاحب کی بات ختم ہو تو اپنی بات کروں۔"

ایک لمحے کے لیے اسحاق کا ہاتھ میز کی دراز کی طرف بڑھا، پھر رُک گیا۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ دو گولیوں سے دو دو لاکھ کا قرض چکا دے لیکن اب اس کا وہ ذہن جس نے بساطِ وقت پر ہر چال سوچ سمجھ کے چلنا سکھایا تھا، اس کے جذبات کی کمان سنبھال چکا تھا۔ ان دو گولیوں کے استعمال کا وقت بھی آئے گا، ضرور آئے گا۔ اس کی عقل نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ایک لاکھ تم کو بھی مل جائیں گے۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔ "لیکن اس سے زیادہ کچھ مت کہنا کیونکہ میری قوتِ برداشت کا پیمانہ ایک لاکھ سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ نہ ہو کہ میں تم کو بھی یہیں شوٹ کر دوں اور اس کے بعد زندگی کی اس سب سے بڑی غلطی پر خود کو بھی سزائے موت دے دوں۔ جاؤ، دفع ہو جاؤ، نکل جاؤ۔"

❦

"آدمی اور مشین میں یہی ایک بنیادی فرق ہے۔" اسحاق نے اطمینان سے اپنی گھومنے والی کشن چیئر کا سہارا لے کر سگار سلگایا۔ "آدمی تھک جاتا ہے اور یہ تھکن بعض اوقات صرف رات بھر سکون کے ساتھ سو لینے سے ختم نہیں ہوتی۔ دو چار دن کی چھٹی کر لینے سے بھی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ماحول وہی رہتا ہے۔ لاشعور میں یہ احساس موجود ہوتا ہے کہ کام نہ کرنے سے نقصان ہو رہا ہے اور یہ چھٹی نہیں ہے، ذمّے داریوں سے گریز ہے۔ آس پاس وہی بھاگ دوڑ اور مشینی زندگی کی ہلچل نظر آتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں لوگ ویک اینڈ پر باہر چلے جاتے ہیں۔ کسی ٹاؤن ہاؤس میں یا مضافات میں۔ لمبی چھٹی لے کر صحت افزا اور تفریحی مقامات کا رُخ کرتے ہیں۔ مقصد وہی ہوتا ہے کہ اس ماحول سے نکل جائیں۔"

"میں سمجھ گیا سر!" بروکر کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا۔ "آپ کو خاموشی چاہیے۔ سکون اور تفریح کے علاوہ پُرآسائش جگہ چاہیے۔"

"ہاں۔ لیکن میں تنگ آگیا ہوں مری اور سوات یا کاغان سے۔" اسحاق نے کہا۔ "دس بار جا چکا ہوں۔"

"اوہ، نو سر! یہ کوئی سیزن نہیں ہے وہاں جانے کا۔"

ٹریول ایجنٹ نے کہا "کاغان کے تو راستے بھی بند ہوں گے، باقی جگہ بھی سردی سے قلفی جم رہی ہو گی۔ آپ کراچی جائیں، سمندر کے ساحل پر۔"

"کراچی، یس۔" اسحاق نے سوچ کر تائید میں سر ہلایا۔ "یہ میرے ذہن میں بھی تھا۔"

"ساحلِ سمندر پر ایک کاٹیج ہے۔ نام پرمٹ جائیے۔ اندر سے اور باہر سے وہ خوبصورتی اور آرام و آسائش کا نمونہ ہے پوری طرح فرنشڈ۔ آپ کا اپنا پرائیویٹ ساحل، صاف چمکتی ریت اور سمندر۔ صبح طلوعِ آفتاب دیکھیے۔ ماہی گیروں کی کشتیوں سے لے کر دیوہیکل بحری جہازوں کی روانگی دیکھیے۔ غسل کیجیے، بامرت لہروں کو دیکھتے رہیے۔ سمندر کی آواز سنتے رہیے۔ میں شرط لگاتا ہوں سر کہ آپ کے اعصاب کو ایک خوشگوار تازگی اور راحت کا احساس ہو گا۔ سمندر کا نظارہ ہی ایک قدرتی سکون آور دوا ہے اور یہاں جو کام سکون آور گولیاں نہیں کرتیں، وہ سمندر کر سکتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے اور آپ کسی سے پوچھ کر دیکھیے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ بات نہیں جو دسمبر میں ہے۔ سمندر کا پانی گرم ہوتا ہے۔ ٹھنڈک صبح ہوتی ہے صرف دو گھنٹے۔ پھر ریت گرم ہونے لگتی ہے اور آپ کو نہاتے ہوئے سردی کا احساس تک نہیں ہو گا۔ نہائیے، ورزش کیجیے۔ موجوں سے کھیلیے۔ ساحل پر چلتے جائیے اور سردی کا احساس ہو تو دھوپ کے نرم گرم بستر پر لیٹ جائیے۔ دیکھیے کس طرح حرارت آہستہ آہستہ آپ کے پورے وجود میں اترتی ہے۔ غسل کے بعد یہ غسلِ آفتابی۔۔۔!"

"میں سمجھ گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کیا بندوبست کر سکتے ہو؟" اسحاق نے کہا۔

"میں اس کاٹیج کی بات کر رہا تھا۔" ایجنٹ نے کہا۔ "ونڈرفل لوکیشن۔ اندر ٹی وی اور فریج تک موجود۔ فشنگ کے لیے بوٹ بھی مل سکتی ہے۔ پھر یہ کہ آپ کراچی جیسے نظر نواز شہر کی رونق سے صرف دس میل دور ہوں گے۔ ایک مہینے کے لیے آپ کرائے کی کار رکھ سکتے ہیں۔ رات کا کھانا کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھائیے۔ انڈونیشی، چائنیز، کونٹی نینٹل، ہر قسم کے ریسٹورنٹ اور کافی ہاؤس اور پھر کراچی کی سوغات نہاری۔"

"میرے پاس وقت کم ہے۔" اسحاق نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہیں کتنی رقم دی جائے کہ ایک مہینے کے لیے؟ اس میں سب کچھ شامل ہونا چاہیے۔ فشنگ بوٹ اور گاڑی تک۔"

ایجنٹ نے فوراً ایک بک سے صفحہ پھاڑ کے چند سطریں لکھیں اور صفحہ آگے بڑھا دیا۔ اسحاق نے اس پر ایک نگاہ ڈال کے اطمینان سے سر ہلایا اور انٹرکام کا بٹن دبایا۔ "مسز رحمان! ایک منٹ کے لیے پلیز۔"

"یس سر۔" مسز رحمان کی آواز آئی۔ ایک منٹ بعد وہ خود پینسل اور نوٹ بک کے ساتھ اندر آگئی۔

"دیکھیے! یہ ٹریول ایجنسی کے نمائندے ہیں۔" اسحاق نے کاغذ کا پرزہ آگے بڑھایا۔ "ان کو اس رقم کا چیک بنا دیجیے اور ان سے دوسری تفصیلات لے لیجیے۔ کوئی ایگریمنٹ ہو تو۔۔!"

"گویا آپ طے کر چکے ہیں سر! کہ ایک مہینے تک باہر رہیں گے۔" مسز رحمان نے مایوسی سے کہا۔ یہ وقت کام کو سنبھالنے کے لیے زیادہ توجہ دینے کا تھا اور اسحاق نے اچانک رخصت پر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا حالانکہ گزشتہ چھ ماہ سے اس کی رخصت ہی چل رہی تھی اور آرام کے سوا اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

"اس کے علاوہ۔" اسحاق نے دراز میں سے ایک فائل نکالی۔ "یہ میری لائف انشورنس پالیسی ہے۔ دو لاکھ کی ڈبل انڈیمنیٹی کے ساتھ۔ گویا میری حادثاتی موت واقع ہو جائے تو رقم چار لاکھ ملے گی۔ اس کا پریمیم ادا کرنا ہے اسی ہفتے میں۔ میرے مرنے سے زبیدہ کو کچھ تو فائدہ ہو۔"

"آپ پہلے سے زیادہ خوش و خرم اور صحت مند واپس آئیں گے سر!" مسز رحمان نے کہا۔ "اور پہلے سے زیادہ ہمت اور دلجمعی کے ساتھ کام کر سکیں گے۔"

ٹریول ایجنٹ نے رشک و حسد کے جذبات کے ساتھ اسحاق کو دیکھا۔ یہ بڑے لوگ صنعت کار اور سیاست داں اور بیوروکریٹ۔ سارا سال آرام کے سوا اور کیا کرتے ہیں۔ ایئرکنڈیشنڈ محلوں سے نکلے تو ایئرکنڈیشنڈ کاروں میں بیٹھ گئے، پھر کسی ایئرکنڈیشنڈ آفس میں دو چار گھنٹے گزار لیے۔ ایسی ہی کسی خوبصورت سیکرٹری کے ساتھ کافی پی لی۔ دو چار دستخط کر لیے یا کسی میٹنگ کی صدارت فرمائی۔ ایک وہ خود تھا کہ انہی لوگوں کو عیش و عشرت کے لوازمات فراہم کرنے کے لیے دن رات سرگرداں تھا۔ کوئی وی آئی پی کسی بھی وقت اس کو اپنے درِ دولت پر طلب کر لیتا تھا۔ پھر مکانوں کو خریدنے اور بیچنے والے، کرائے پر لینے اور دینے والے۔ ان کی پسند ناپسند اور گنجائش کے مطابق جگہ دیکھنا، ان کو مطمئن کرنا اور ان کے معاملات طے کرانا اور پھر دونوں طرف سے نقصانات کی ذمے داری قبول کرنا۔ اس سب تگ و دو کے مقابلے میں کمیشن کیا ہے۔ کوئی یوں در بدر، گلی گلی پھر کے تو دیکھے۔ آرام اور تفریح کے یہ رئیسانہ چونچلے اس کے مقدر میں کہاں؟

"کل تک آپ روانہ ہو سکیں گے سر!" ایجنٹ نے کہا۔

"کل تک؟ اوہ نو، مجھے کم سے کم ایک ہفتہ چاہیے۔" اسحاق نے کہا۔ "آپ ٹکٹ لے لیں اور وہ کاٹیج حاصل کر لیں۔ سیٹ کنفرم کرنے کے لیے میں آپ کو فون کر دوں گا۔"

ایجنٹ کے جانے کے بعد اسحاق نے مسز رحمان کو دفتری

کار ویلا اور انشورنس پالیسی کے بارے میں دوبارہ ہدایات دیں۔
" فی الحال کوئی اور کام نہیں ہے۔ آپ جانا چاہیں تو اجازت ہے۔" اسحاق نے کہا اور مسز رحمان کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ہال جیسے آفس کی چاروں دیواروں پر فرش سے چھت تک الماریاں تھیں اور ان میں قانون کی ضخیم کتابیں بھری پڑی تھیں۔ پی ایل ڈی کے علاوہ دنیا بھر کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے مجلد البوم۔ چند کتابیں ہٹا کے اس نے ایک الماری کے پیچھے سے سیلوفین میں لپٹا ہوا ریوالور نکالا اور اس کی حالت کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بہترین غیر ملکی ریوالور تھا اور اس کے ایک مؤکل کا تحفہ تھا جسے اسحاق نے آخری اپیل میں سزا سے صاف بچا لیا تھا۔ اسحاق کا اپنا لائسنس والا ریوالور ہمیشہ میز کی دراز میں موجود رہتا تھا مگر تحفے میں ملنے والے اس ناجائز اسلحے کی اہمیت ہی جدا تھی۔ اب تک کبھی اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن ضرورت پڑنے پر یہ اس کا قابلِ اعتماد دوست ثابت ہو سکتا تھا۔ اعشاریہ تین دو کا آٹومیٹک براؤننگ پانچ سال پرانا ہونے کے باوجود بالکل نیا نظر آتا تھا کیونکہ اسحاق اس کی دیکھ بھال کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ اس کے تمام کل پُرزے بہترین کارکردگی کے ضامن تھے۔ اس نے ریوالور کو پھر سیلوفین میں لپیٹا اور اسی جگہ رکھ دیا۔

گھر واپس لوٹتے ہوئے ایک بار پھر اس نے اپنے منصوبے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اسے رشتے داروں کا، دوست احباب کا، اپنے ہم پیشہ افراد کا اور ان گنت جاننے والوں کا خیال آیا جو پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ حلف اُٹھا کے کہہ سکتے تھے کہ وہ بیرسٹر زاہد اسحاق کو پہچانتے ہیں اور جانتے ہیں لیکن اسحاق نے ان سب سے کچھ چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے منصوبے کی کامیابی کا انحصار ہی اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر پر تھا چنانچہ اب بیشتر لوگ اس کے منصوبے سے واقف تھے اور اسحاق کو یقین تھا کہ یہی واقفیت بالآخر اس کی کامیابی کی ضامن ہوگی۔ اس کی سیاہ مرسڈیز سبک خرامی سے شادمان ٹاؤن میں واقع "قصرِ زبیدہ" کی طرف بڑھتی رہی۔

"قصرِ زبیدہ" چار کنال کے رقبے پر محیط جدید وضع کی عمارت تھی جس کا نصف کے قریب حصہ باغ پر مشتمل تھا۔ سامنے والے حصے میں پورے ایک کنال کا لان تھا۔ عقبی حصے کے باغ میں ٹیوب ویل، سرونٹ کوارٹر اور گیراج بھی تھے۔ سرونٹ کوارٹر میں ایک بڈھا بڑھیا مقیم تھے جو گھر کے سارے کام مل کر کرتے تھے۔ شوہر بیک وقت مالی بھی تھا اور عقبی حصے میں ٹماٹر اور ہری مرچوں کی کاشت پر پورے باغ سے زیادہ توجہ دیتا تھا۔ وہ چوکیدار بھی تھا اور ویٹر بھی۔ اس کی بیوی گھر کے اندر ہر وقت صفائی میں مصروف نظر آتی تھی اور وقت ہوتے ہی کچن میں پہنچ کے ناشتے یا کھانے کے انتظام میں لگ جاتی تھی۔ ان کے درمیان ہر روز کے مینو پر اختلاف رائے بعض اوقات دلچسپ لڑائی کی صورت اختیار کر لیتا تھا حالانکہ زبیدہ یا اسحاق میں سے کسی کو بھی اس سے دلچسپی نہیں ہوتی تھی کہ آج کیا پکے گا۔

بچوں کی عدم موجودگی میں قصرِ زبیدہ کے دیوار و در پر خاموشی کی تہہ شہرِ خموشاں کے سناٹے سے زیادہ گہری لگتی تھی۔

اپنے بیڈروم میں پہنچ کے اس نے بریف کیس کو صوفے پر پھینک دیا اور خود بیڈ پر جوتوں سمیت دراز ہو گیا۔ زندگی کے گیارہ سال ایک بار پھر اس کے گرد حلقہ بنا کے آ کھڑے ہوئے۔ جب اس نے شادی کی تھی تو وہ ایک نیا وکیل تھا۔ ناتجربہ کار اور مفلس مگر پُرعزم اور ذہین۔ یہ بات زبیدہ کے وکیل باپ نے فوراً نوٹ کر لی تھی کہ اس کے پاس چھ ماہ کے لیے بطور معاون آنے والا وکیل ایک دن کامیاب ایڈووکیٹ بنے گا۔ جو بات اس شریف آدمی نے نوٹ نہیں کی تھی، وہ اسحاق کی ترقی اور کامیابی کے لیے جنون کا درجہ رکھنے والی خواہش تھی۔ ایک سرکش اور بے لگام قوت جو کسی آتش فشاں کی طرح اس کے وجود میں لاوا بن کے اُبل رہی تھی جو راستے کی تمام رکاوٹوں کو گرا کے، جلا کے خاکستر کرتی ہوئی صرف آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

جائز اور ناجائز وسائل میں تفریق کیے بغیر اور اخلاقی یا قانونی اصولوں کی دیواروں کو نظرانداز کرتے ہوئے اسحاق صرف شہرت اور عزت کے ساتھ حصولِ دولت کی منزل تک پہنچنے کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتا تھا۔ پہلے سال ہی میں اس نے زبیدہ کے باپ کی ایک اور ضرورت کا اندازہ کر لیا جسے کوئی اور پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے خلوصِ نیت اور شرافت و انسانیت کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے سخت جدوجہد کی اور بالآخر زبیدہ کے باپ کو یقین آ گیا کہ یہ نوجوان اس کی دولت کی خاطر زبیدہ کو نہیں چاہتا۔ اس پر ترس کھا کے زبیدہ کو قبول نہیں کر رہا ہے اور یہ تائیدِ ایزدی ہے کہ معاون کے روپ میں خدا نے اس کے لیے ایک فرشتہ بھیج دیا ہے جو اس کے مصائب و مسائل میں اس کا دستِ راست ثابت ہوگا۔ اس نے بدصورت، ذہنی طور پر معذور، نفسیاتی مریض اور فاترالعقل زبیدہ کو اپنی تمام دولت اور جائیداد سمیت اسحاق کے سپرد کر دیا۔

" ان دونوں کے مالک اور محافظ خدا کے بعد تم ہی ہو۔" زبیدہ کے باپ نے کہا تھا۔

زبیدہ جوان تھی مگر خوبصورت نہ تھی اور کسی بھی عورت سے کم نہ تھی مگر پاگل تھی۔ اس کے پاگل پن میں جنون کی کیفیت نہیں تھی۔ وہ کسی کو کاٹنے یا مارنے نہیں دوڑتی تھی، کپڑے نہیں

پھاڑتی تھی اور دیواروں سے سر نہیں ٹکراتی تھی۔ وحشت میں چیخ و پکار نہیں کرتی تھی۔ جب اس پر دورہ پڑتا تھا تو وہ بلاوجہ ہنستی رہتی تھی اور رونے پر آتی تھی تو خاموشی سے آنسو بہاتی رہتی تھی۔ بعض اوقات دن میں تین مرتبہ کپڑے بدلتی رہتی تھی اور یوں میک اَپ کرتی تھی کہ دُلھن نظر آتی تھی۔ پھر موڈ بدل جاتا تھا تو وہ ہفتہ بھر منہ تک نہیں دھوتی تھی۔ میلے کپڑے پہنے اور سر کے اُلجھے بال لیے وہ کمروں کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ یہی حال اس کے سونے اور کھانے کا تھا۔ اسحاق نے اسے مسلسل بہتر گھنٹے جاگتے دیکھا تھا جب کوئی خواب آور دوا اثر نہیں کرتی تھی۔ اور اسے مسلسل بہتر گھنٹے سوتے بھی دیکھا تھا۔ جب وہ نیند میں ہی اُٹھ کر کچھ کھا لیتی تھی اور پھر سو جاتی تھی۔ اس کی یادداشت کبھی اچانک بہت اچھی ہو جاتی تھی تو کبھی اسے اپنا نام تک یاد نہ آتا تھا۔ اس نے میٹرک تک مشکل سے پڑھا تھا لیکن کسی اسکول میں نہیں۔ ایک ٹیوٹر یا گورنس دو ہزار روپے ماہانہ پر دن رات زبیدہ کے ساتھ سر کھپاتی تھی۔ اسحاق کو یقین تھا کہ اب وہ خود نفسیاتی مریض ہو گی۔ زبیدہ کے امتحان دینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ بالکل جاہل نہیں رہی تھی۔

شادی کے بعد اس کی حالت میں ایک خوشگوار تغیّر رونما ہوا اور ذہنی امراض کے ماہرینِ نفسیات خاصے پُرامید نظر آنے لگے۔ شادی کے دو سال بعد اتفاق رائے سے اسے امریکا بھیج دیا گیا جہاں طبّی، نفسیاتی اور سرجیکل طریقۂ علاج کے بہترین مواقع میسّر تھے۔ اسحاق کو سخت مایوسی ہوئی کہ اس کے اندازے غلط ہونے لگے ہیں۔ اس کے یقین کے مطابق زبیدہ کے باپ کو شادی کے ایک سال بعد مر جانا چاہیے تھا۔ اس کے معالج بہت پہلے طے کر چکے تھے کہ وہ جس سرطان کی گرفت میں ہے اس میں زندگی کی اتنی ہی مہلت مل سکتی ہے۔ جائیداد کو زبیدہ کے باپ نے کامل اعتماد کے ساتھ اسحاق کے نام کر دیا تھا کیونکہ ذہنی طور پر ناکارہ زبیدہ اس کی دیکھ بھال کی اہل نہ تھی۔ اپنی زندگی میں ہی زبیدہ کے باپ کو یہ اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے فیصلے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اسحاق پوری تندہی سے زبیدہ کا علاج کرا رہا تھا اور اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے محبت بھی دیتا تھا اور عزّت بھی۔ ایک کے بجائے دو سال گزر گئے اور زبیدہ کا ذہن تیزی سے نارمل ہونے لگا تو اسحاق کو اپنے خواب ٹوٹتے نظر آنے لگے۔ زبیدہ کا باپ پہلے ہی سال میں مر جاتا تو وہ زبیدہ کو پاگل خانے میں داخل کرا دیتا اور پھر بے فکر زندگی گزارتا لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اس نے جس زنجیر کو عارضی سمجھ کے قبول کیا تھا، وہ تمام زندگی کے لیے اس کا مقدر ہو چکی ہے۔

وہ امریکا میں ہی تھا کہ اسے زبیدہ کے باپ کے مرنے کی خبر ملی اور وہ علاج کو ادھورا چھوڑ کے فوراً واپس آ گیا لیکن اس وقت تک زبیدہ نارمل ہو چکی تھی۔ باپ کی موت کے صدمے نے بھی اسے پاگل نہیں کیا اور اسحاق کی یہ اُمید بھی بالآخر خاک میں مل گئی کہ زبیدہ پھر دیوانگی کی اس منزل تک لوٹے گی جہاں سے اس نے اسحاق کے ساتھ زندگی کی رفاقت کا آغاز کیا تھا۔ اسحاق نے اس کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا اور اسے ہر طرح سے ذہنی اذیّت دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی مگر زبیدہ وقت کے ساتھ ساتھ گھر پر حکمران ہو گئی اور آمدنی و خرچ کا حساب رکھنے کے علاوہ اسحاق کی پیشہ ورانہ اور گھر سے باہر کی زندگی پر بھی نظر رکھنے لگی۔ اس کا نتیجہ تلخی اور کشیدگی کی صورت میں نمودار ہوا۔ بدصورت زبیدہ کی بے بسی یہ تھی کہ وہ اپنی جائیداد کی مالک بھی نہیں رہی تھی۔ یہ غلطی اس کے باپ نے کی تھی مگر زبیدہ تہیّہ کر چکی تھی کہ اس غلطی کا کفارہ وہ ادا نہیں کرے گی۔ ایک سال میں ان کے درمیان فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ میاں بیوی ہونے اور ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود وہ اجنبی ہو گئے۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اسحاق نے مرد کی حیثیت سے وہ ٹرمپ کارڈ پھینک دیا جس کے بعد عورت کی ہار یقینی ہو جاتی ہے۔ ایک غیر تعلیم یافتہ اور عورت کے معاملے میں مرد کو بالادستی فراہم کرنے والے معاشرے میں کوئی نہیں سمجھتا کہ قدرت کے نظامِ تخلیق میں کوئی ناانصافی نہیں ہے۔ اسحاق کے لیے طلاق دینا تو نکاح نامے اور وصیّت نامے کی رُو سے ناممکن تھا مگر اس نے شادی کے پانچویں سال میں زبیدہ کے بے اولاد ہونے کو عذر بنا کے عقدِ ثانی کی اجازت حاصل کرنا چاہی، زبیدہ کے انکار پر اس نے مقدمہ عدالت میں پیش کیا۔ اسحاق کو پہلی ذلّت آمیز شکست اس دن ہوئی جب میڈیکل بورڈ نے عدالت کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ قصوروار صرف زبیدہ ہی نہیں۔ بانجھ اگر عورت ہو سکتی ہے تو ایک مکمل مرد بھی ہو سکتا ہے اور بانجھ پن کا تناسب ہر جگہ برابر ہے۔ عقدِ ثانی کی درخواست خارج ہو گئی اور اب شادی کے گیارہ سال بعد وہ قیدِ حیات کاٹنے والے دو اسیروں کی طرح تھے جن کو ایک ہی زنداں میں بند کر دیا گیا ہو۔ کبھی کبھی اسحاق کو خیال آتا تھا کہ زبیدہ بدصورت ہے تو کیا، آخر وہ کسی بھی عام مرد اور عورت کی طرح نارمل زندگی کیوں نہیں گزار سکتے لیکن مخالف منفی رویّوں... کے درمیان حائل نفرتوں کی خلیج اتنی پھیل چکی تھی کہ اب اسے پاٹنا ناممکن تھا۔

لباس تبدیل کیے بغیر وہ اپنے کمرے سے نکلا اور زبیدہ کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنے بیڈ پر تکیہ نیچے دبائے

اُلٹی لیٹی ہوئی تھی اور وی سی آر لگا کے ٹی وی پر کوئی واہیات انڈین فلم دیکھ رہی تھی۔ اسحاق نے کچھ کہے بغیر پلگ نکال دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" زبیدہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔

"شرم نہیں آتی تم کو اس قسم کی فلمیں دیکھتے ہوئے؟" اسحاق نے صوفے پر بیٹھ کے کہا۔ "ہزار بار منع کیا ہے۔"

"تم کون ہوتے ہو مجھے منع کرنے والے؟ پہلے اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھو کہ تمھاری زندگی کیسی فلم ہے۔" زبیدہ نے چیخ کر جواب دیا۔ "شرم اگر تم کو نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے۔"

"میں تمھاری بکواس سننے نہیں، ایک اہم مسئلے پر بات کرنے آیا ہوں۔" اسحاق نے سگار جلا کے کہا۔

"یا میرے خدا!" زبیدہ ہنسی۔ "یہ میں کیا سُن رہی ہوں، میرے سرتاج اور خداوندِ مجازی مجھ سے بات کرنے آئے ہیں اور وہ بھی ایک اہم مسئلے پر۔"

"مسئلہ صرف میرا ہی نہیں، تمھارا بھی ہے۔" اسحاق نے کہا۔ "اگر تم نے سمجھنے کی کوشش نہ کی اور مجھ سے تعاون نہ کیا تو ہم سے یہ سب کچھ چھن جائے گا جو ہمارے پاس ہے۔"

"یہ سب مجھ سے تم نہیں چھین سکے تو تم سے کوئی کیسے چھین سکتا ہے؟"

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" اسحاق نے برہمی سے کہا۔ "سلیم کے جیل جانے کے بعد میں نے نیلم کو ایک فلیٹ میں رکھا تھا اور کرائے نامے پر اپنا نام خالد محمود کسٹم آفیسر لکھا تھا۔ میرا مقصد بدنامی سے بچنا تھا۔ نیلم نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا کہ سلیم کو چھوڑ دینے پر تیار ہو گئی اور میں تو اس کو بیوقوف ہی بنا رہا تھا کہ میں سب کچھ چھوڑ کے اس کے ساتھ کسی بھی جگہ جا سکتا ہوں مگر آج انکشاف ہوا کہ بے وقوف وہ مجھے بنا رہی تھی۔ وہ سلیم کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی اور وہ سب سازش تھی۔ سلیم رہائی کے بعد آج نیلم کے ساتھ آ پہنچا اور انھوں نے پچاس ہزار تو وہیں وصول کر لیے۔ وہ خاموش رہنے کے دو لاکھ اور مانگ رہے ہیں۔ کیونکہ میرے خلاف ایک دستاویزی ثبوت تو کرایہ نامہ ہے۔ وہاں کئی چشم دید گواہ ہیں۔ مجھ پر جعلسازی اور دھوکا دہی کے مقدمات بنتے ہیں، حدود آرڈیننس کے الگ، چنانچہ میرا مستقبل خطرے میں ہے۔ افشائے راز کا مطلب ہے ذلت و رسوائی اور جیل۔ میری پریکٹس تو ختم ہو ہی گئی ہے، شاید میں وکالت بھی نہ کر سکوں۔"

"اپنے بوئے ہوئے کو کاٹنے سے ڈرتے کیوں ہو۔" زبیدہ مسکرائی۔ "دو لاکھ میں سزا سے بچ سکتے ہو تو دو لاکھ دے دو۔"

> **ایک** نوجوان اپنی محبوبہ سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: "میرے پاس محمود سپرا کی طرح بے حساب دولت نہیں ہے، میرے پاس محمود سپرا کی طرح عالیشان محل نہیں ہے۔ میں محمود سپرا کی طرح تمھیں ہیرے جواہرات سے نہیں لاد سکتا لیکن میرے پاس محبت ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"
>
> "میں بھی تمھیں چاہتی ہوں۔" لڑکی نے جواب دیا "لیکن مجھے محمود سپرا کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"میرے پاس دو لاکھ نہیں ہیں۔" اسحاق نے کہا۔ "اب شاید بنک میں دو ہزار بھی نہ ہوں۔"

"پھر کیا ہوا، تم اپنا گلبرگ والا بنگلا بیچ سکتے ہو۔ تمھیں تین چار لاکھ مل ہی جائیں گے۔" زبیدہ نے کہا۔

"وہ میں پہلے ہی بیچ چکا ہوں۔" اسحاق نے کہا۔ "اسی سے میں نے تمام واجبات ادا کیے۔ ماتحت عملے کی تنخواہ، آفس کا کرایہ، بجلی اور ٹیلیفون کا بل۔ پراپرٹی ٹیکس اور انکم ٹیکس ادا کیے۔ اب میں نے اپنا عملہ تقریباً ختم کر دیا ہے اور ایک معمولی سا آفس لے لیا ہے۔"

"لیکن تم اتنے بڑے وکیل ہو، کیا تم پولیس سے بھی مدد نہیں لے سکتے؟" زبیدہ نے متفکر ہو کے کہا۔

"تم واقعی احمق ہو۔" اسحاق نے کہا۔ "تمھاری ناقص عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ میں ان کے خلاف بلیک میلنگ کا ایک مقدمہ درج کراؤں گا تو وہ میرے خلاف دس مقدمات کھڑے کر دیں گے۔ زیادہ سنگین اور رُسوا کن۔ کیا ان کی اور میری حیثیت ایک سی ہے؟ وہ تو جیل جانے کے بعد بے عزت ہو کے بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی بھی دوسرے شہر میں جا کے کوئی بھی کام کر سکتے ہیں لیکن میں جیل سے نکل کے وکالت نہیں کر سکتا۔ نہ یہاں، نہ کسی اور شہر میں۔ سارا نقصان تو میرا ہوا ہے۔ میں بار ایسوسی ایشن کا صدر بننا چاہتا تھا۔ سیاست میں حصہ لے کر اسمبلی اور وزارت تک پہنچنا چاہتا تھا۔"

"جب تم اپنے ایکٹر دوست اور مؤکل کو جیل بھجوا کے اس کی خوبصورت اور بدچلن منگیتر پر ڈورے ڈال رہے تھے تو تمھیں نہ اپنی تباہی کا کچھ خیال تھا، نہ میرا۔ تمھیں اپنی عقل پر ناز تھا اور اپنی شہرت کا غرور تھا۔" زبیدہ نے کہا۔

"زبیدہ! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ قدرت نے مجھے بہت بڑا سبق دیا ہے۔" اسحاق نے کہا۔ "تمھاری طرح مجھے بھی عیش و عشرت کی یہ زندگی عزیز ہے۔ میں مفلسی کا عذاب بھی برداشت نہیں کر سکتا اور بے آبرو ہو کے بھی نہیں جی سکتا۔ مجھے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے، تمھارے ساتھ۔"

"تم مجھ پر کوئی نیا حربہ تو نہیں آزما رہے ہو؟" زبیدہ نے محتاط ہو کے کہا۔

"نہیں زبیدہ! میں چاہتا ہوں ہم دونوں ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر دیں۔" اسحاق نے کہا۔ "ایک دوسرے سے تعاون کے بغیر ہم تباہی سے نہیں بچ سکتے کیونکہ میں جانتا ہوں بلیک میلر کبھی مطمئن نہیں ہوتے، نہ دو لاکھ لے کر نہ دو کروڑ لے کر۔ وہ قناعت کرنے والے اور اُصول پرست نہیں ہوتے اور اسی لیے میں نے طے کیا ہے کہ ان کا کوئی مطالبہ پورا نہ کروں۔ تم میری مدد کرو گی تو ہم یہی ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزار سکیں گے۔ اس کے لیے مجھے اپنا پیشہ بدلنا ہوگا اور یہ شہر چھوڑنا پڑے گا اور بھی بہت کچھ چھوڑنا پڑے گا۔"

"اور اگر میں تمھاری مدد کرنے سے انکار کر دوں تو؟" زبیدہ نے کہا جس کی سمجھ میں ابھی تک اسحاق کی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

"تو تم بھی ہار جاؤ گی۔ تمھارا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا اور تمھیں پناہ دینے والا کوئی نہ ہوگا۔" اسحاق نے کہا۔ "ذرا سی دیر کے لیے گزرے ہوئے وقت کو بھول جاؤ۔ میں مانتا ہوں زیادتی میں نے کی تھی۔ ظلم میں نے کیا تھا۔ کمینہ میں تھا لیکن سوال مستقبل کا ہے۔ کیا اپنی اپنی غلطیوں کی تلافی کے لیے اب بھی وقت کافی نہیں ہے؟ آخر اس طرح ہم کتنے دن گزارا کر سکتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن ہم میں سے کوئی پاگل ہو جائے گا۔ خودکشی کر لے گا یا دوسرے کو قتل کر دے گا۔ یہ قید سے سخت تر سزا ہے۔ چلو ہم قدرت کے فیصلے کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔ اولاد ہمارے مقدّر میں نہ تھی مگر ہمارے مقدّر میں زندگی کے سکھ تو ہیں۔ آپس کی دشمنی میں ہم ان سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ تم اگر مجھے معاف کر سکو تو ہم پھر اسی طرح رہ سکتے ہیں جیسے شادی کے بعد رہتے تھے، جیسے دنیا میں سب میاں بیوی رہتے ہیں جن کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔"

"تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" زبیدہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ عورت تھی اور اس کا وجود ایک ناسور بن گیا تھا۔ اسحاق کے چھیڑنے سے یہ ناسور بہنے لگا۔

اسحاق نے اس کے آنسو صاف کیے۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ہم دونوں کی بقا اسی میں ہے زبیدہ! الگ رہ کے اور آپس میں دشمنی رکھ کر ہم اپنی خوشیوں کے دشمنوں کو شکست نہیں دے سکتے۔ نہ میں اکیلا کچھ کر سکتا ہوں اور نہ تم اکیلی رہ سکتی ہو۔ ہمیں اپنی زندگی کے سکھ چین کو بچانے کے لیے متحد ہونا پڑے گا۔ ایک دوسرے کی مدد کرنی ہوگی۔ مجھے بہت کم امید ہے کہ محنت کے باوجود میری پریکٹس دوبارہ جم سکے اور بالفرضِ محال میں کامیاب ہو بھی گیا تو جتنا میں کماؤں گا وہ سب بلیک میلر لے جائیں گے۔ ایک طریقہ تو یہی ہے کہ میں ان دونوں کو قتل کر دوں لیکن دوسرا راستہ پُرسکون اور محفوظ مستقبل کا ضامن ہے۔ میں گھر سے باہر ہی نہیں گھر کے اندر بھی سکون چاہتا ہوں۔"

"سکون تو میرے لیے بھی ایک خواب ہے۔ کیا اس کی تعبیر مل سکتی ہے؟" زبیدہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس کی تعبیر میرے پاس ہے۔ ہم نے جو کچھ کھو دیا اس کا غم بھول جاؤ۔ یہ سوچو کہ اب ہم ایک دوسرے کی رفاقت میں کیا پا سکتے ہیں۔" اسحاق نے کہا۔ "میرے پاس اب بھی اتنی دولت ہے کہ ہم باقی زندگی عیش کے ساتھ گزار سکتے ہیں لیکن صرف اس صورت میں کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ فاصلوں کو کم کریں اور اس دُنیا سے دُور جا کے رہیں۔ جہاں کوئی ہمیں تلاش نہ کر سکے اور کر بھی لے تو ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ بتاؤ ساتھ دو گی میرا؟"

"میں نے تو تمھارے ساتھ رہنے کے لیے زندگی کے جہنم کو بھی قبول کیا ہے۔" آنسو زبیدہ کی آنکھوں سے بہتے رہے۔ "تم نے ہی مجھے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ اب تم وعدہ کر رہے ہو کہ میرے درد کا درماں فراہم کر دو گے تو میں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔ تم کہو تو سہی مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کام مشکل ہے لیکن ہم دونوں کی سلامتی اور خوشی کے لیے کوئی اور ضمانت نہیں۔" اسحاق نے کہا۔

"میں سب کچھ کر سکتی ہوں اسحاق! تمھارے لیے ہی تو میں نے موت سے بدتر زندگی کو عزیز جانا، ورنہ میں خودکشی نہ کر لیتی۔"

"اگر میں کہوں کہ تم کو میری خاطر ایک قتل کرنا ہوگا؟"... اسحاق نے کہا۔

زبیدہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ "مجھے یقین تھا یہ دھوکا ہے۔ تمھاری باتوں میں زہر کی جگہ مٹھاس کیسے پیدا ہو گئی ہے۔ اتنا بے وقوف سمجھتے ہو تم مجھے۔ بلیک میل کوئی تم کو کر رہا ہے تو تمھارے کرتوتوں کے باعث۔ تم مجھے سنہرے خواب دکھا کے تختۂ دار تک پہنچانا چاہتے ہو۔ نہیں اسحاق! مجھے تمھارے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قتل کرنا ہے تو خود کر دو انھیں۔"

اسحاق ہنسا۔ "جانتی ہو اس قتل سے تمھیں کیا ملے گا! چار لاکھ روپیہ سکۂ رائج الوقت جو میری زندگی کی قیمت ہے۔ میرے مرنے کے بعد دو لاکھ کی انشورنس پالیسی کے بدلے تم کو دُگنی رقم کی ادائیگی ہوگی۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں قتل کر دوں؟" زبیدہ بے ساختہ ہنسی۔ "میں اب پاگل نہیں رہی اسحاق!"

"سنجیدگی سے میری بات سنو زبیدہ!" اسحاق مسکرایا۔ "میں نے آج کراچی میں ساحلِ سمندر پر ایک ہٹ کرائے پر حاصل کی ہے اور اس کاٹج کا ایک ماہ کا کرایہ بھی ادا کردیا ہے۔ دفتر میں اور اپنے سب ملنے جلنے والوں کو بتا دیا ہے کہ ہم وہاں تفریح کے لیے جارہے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ واپس نہ آؤں اور وہیں انتقال کر جاؤں۔"

"کیا اس بات کا مطلب میں اُلٹا لوں کہ میں واپس نہیں آؤں گی؟" زبیدہ نے کہا۔ "تم بھلا کیوں مروگے اور مرنے کے بعد عیش و عشرت، سکون اور تحفظ کی وہ زندگی جس کا تم مجھے خواب دکھا رہے تھے؟"

"مطلب بالکل سیدھا ہے۔ مرے گا کوئی اور تصدیق میری موت کی ہوگی۔" اسحاق نے کہا۔

"کیا تمھارا کوئی جڑواں بھائی ہے؟ اور اگر ہے تو اس کو قتل کرکے تم خوش رہ سکو گے؟" زبیدہ نے کہا۔

"یہ فضول اتفاقات فلموں میں ہوتے ہیں۔" اسحاق بولا۔ "مجھے تو کوئی بھی ایسا شخص چاہیے جو قد و قامت میں میرے برابر ہو اور جس کے خطوط مسخ ہونے کے بعد بہت زیادہ مختلف نظر نہ آئیں۔ اس کی رنگت، آنکھیں اور بال میرے جیسے ہوں تو کام چل سکتا ہے۔ کوئی مکرانی یا پستہ قد چینی میری جگہ نہیں لے سکتا مگر ان سب کو دیکھو جو ہمارے آس پاس ہیں۔ اگر وہ مختلف ہیں تو صورت کے اعتبار سے۔ صورت نہ پہچانی جائے تو سب سے بڑا ثبوت تمھاری شناخت ہے۔ اگر تم تصدیق کرو کہ یہ میرا شوہر اسحاق ہے تو کوئی اور انکار کیسے کرسکتا ہے۔"

"اور ایسا شخص تم کہاں سے لاؤ گے جو تمھاری لاش بن کے دفن ہونا قبول کرلے؟"

"تمھیں کیا معلوم زبیدہ! کہ اس دنیا میں کتنے لاوارث اور تنہا لوگ ہیں جو ایک بے مصرف زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے جینے مرنے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا، خود انھیں بھی نہیں؟" اسحاق نے کہا۔ "عدالتوں میں ہر روز ایسے افراد پیش کیے جاتے ہیں جو کسی فٹ پاتھ پر، کسی پارک میں یہاں تک کہ سڑک کے بیچ میں لیٹے ہوئے ملتے ہیں۔ چرس اور ہیروئن کے عادی کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھائے جاتے ہیں اور نالیوں میں پڑے ملتے ہیں۔ ان کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا جو اُن کی فکر کرے۔ وہ جرمانہ ادا نہیں کر پاتے تو جیل جاتے ہیں اور رہا ہوتے ہیں تو پھر پکڑے جاتے ہیں۔ سیکڑوں ایسے ہیں جن کا ضامن کوئی نہیں چنانچہ وہ برسوں سے جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں اور ان کا مقدمہ سماعت کے لیے پیش ہی نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ایک ہفتے میں مجھے کوئی نہ کوئی ایسا ہی آدمی مل جائے گا جو گُم بھی ہوجائے گا تو کسی کو فکر نہ ہوگی۔"

"اور تم اس کی لاش کے بدلے چار لاکھ وصول کرو گے؟ یہ قتل سے گھناؤنا فعل ہے اسحاق!" زبیدہ نے کہا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں سچ مچ مرجاؤں تو کیا تم کو دو لاکھ نہیں ملیں گے؟" اسحاق نے برہمی سے کہا۔ "کوئی دشمن مجھے مار ڈالے یا میں کسی حادثے کا شکار ہوجاؤں تو چار لاکھ۔ کیا یہ میری لاش کی قیمت نہیں ہوگی؟ اور پھر مجھے یہ بتاؤ کہ اس شخص کے وجود کا مصرف کیا ہے جو کتّوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہے؟ ہماری زندگی تو اس قابل ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ ہم قصرِ زبیدہ کو بیچ دیں گے۔ اس سے آٹھ لاکھ ضرور ملیں گے۔ چار لاکھ انشورنس کے ہوں گے۔ بارہ لاکھ سے ہم کراچی میں کوئی بڑا بزنس کریں گے۔ جس سے ہمیں کم سے کم پچاس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی ہوگی اور بزنس پھیلے گا تو آمدنی بڑھے گی۔ ہم قصرِ زبیدہ سے بڑا محل خرید لیں گے۔"

"وہ بارہ لاکھ تمھاری تحویل میں ہوں گے۔ مجھے صرف تمھارے دُکھ ملیں گے۔" زبیدہ نے تلخی سے کہا۔

"نہیں، ہم ایک مشترکہ اکاؤنٹ رکھیں گے۔" اسحاق نے کہا۔ "جوائنٹ آپریشن۔ ہر چیک پر دونوں کے دستخط ہوں گے اور سب رقم اسی اکاؤنٹ میں جمع ہوگی۔ البتہ میرے مرنے کے بعد جو چار لاکھ ملیں گے وہ تمھارے ہاتھ میں آئیں گے۔ تم چاہو تو اس رقم کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکتی ہو اور مجھے چھوڑ کے بھی جا سکتی ہو۔ بیوہ ہونے کے بعد تم آزاد ہو جاؤ گی۔ چار لاکھ بھی کم نہیں ہوتے مگر میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ رہنے میں تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں وعدہ کر چکا ہوں کہ جو کچھ میں تمھیں آج تک نہیں دے سکا، وہ اب ضرور دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھیں کچھ نہ دے کر میں نے ہی سب کچھ گنوایا ہے۔ ابھی بہت زندگی باقی ہے اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے۔"

"مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے اسحاق!" زبیدہ بولی۔ "یہ خیال تمھارے ذہن میں اچانک نہیں آیا۔ تم نے اپنا منصوبہ بہت سوچ سمجھ کے بنایا ہے۔ ساری تفصیلات طے کرنے کے بعد تم میرے پاس آئے ہو۔"

"میں نے تمھیں سب سچ بتا دیا ہے۔" اسحاق نے کہا۔ "تم ہر طرح سے محفوظ ہو مگر یہاں نہیں۔"

"وہاں بھی تمھارے قتل کا الزام مجھ پہ آسکتا ہے۔" زبیدہ نے کہا۔

"تم کو صرف لاش کی شناخت کرنی ہے۔" اسحاق بولا۔ "جس

رات قتل ہوگا تم کہیں بھی جا کے رہ سکتی ہو جہاں تمہاری موجودگی کے معتبر گواہ ہوں۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ تم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی ایک رات گزار سکتی ہو۔"

اسحاق کے ساتھ خوشگوار اور پُرمسرت ازدواجی زندگی کا خواب سچ ہو رہا تھا۔ زبیدہ کی آنکھیں اب اور کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس کے تصور میں ایک نئی زندگی تھی۔ وہ زندگی جس کی تمنا میں اس نے کانٹوں کی سیج پر بارہ سال گزار دیے تھے۔ اس کا ذہن اسحاق کا ساتھ دینے کے لیے مچل رہا تھا۔ اسے قائل کر رہا تھا کہ مجرم تو اسحاق بھی ہوگا۔ تم اس کی شریکِ حیات ہو تو شریکِ جرم بھی ہو جاؤ۔ تاکہ کل کے لیے عیش و عشرت کی حقیقی زندگی ایک یقین میں ڈھل جائے۔ اسحاق کی غلطیوں کی سزا یہ نہ ہو کہ اس کا بھی سب کچھ چھن جائے۔ خود اسے بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے اور اب دیر سے ہی سہی مگر اسحاق اس کا سہارا بن رہا ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آ رہا ہے تو گھر کے دروازے تو اس پر بند نہیں کرنے چاہئیں۔ اسے اسحاق کے سچ پر اعتبار کرنا ہی ہوگا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اسحاق!"

"ڈرو اس وقت سے جب ہم اسی شہر میں خوار و زبوں ہوں گے، مفلس و قلاش پھریں گے اور تماشا بنیں گے۔" اسحاق نے کہا۔

زبیدہ سچ مچ ڈر گئی "نہیں نہیں، ہم چلے جائیں گے یہاں سے۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم اس شخص کو کراچی کیسے لے جاؤ گے جسے بالآخر تمہارے اور میرے لیے مرنا پڑے گا؟"

"یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔" اسحاق مسکرایا کیونکہ زبیدہ اس کی توقعات پر پوری اتری تھی۔ اس کے منصوبے کا ایک اور مرحلہ کامیابی کا ضامن بن گیا تھا۔ "میں اسے تلاش بھی کرلوں گا اور اپنے ساتھ بھی لے جاؤں گا لیکن تم ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ جو قدم ایک بار آگے اٹھے گا وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ تم میں ہمت ہے تو ہاں کہو اور اعتماد نہیں ہے تو اسی وقت انکار کر دو۔ اس کے بعد ہر مرحلے پر تم کو وہی کرنا ہے جو میں کہوں۔"

"مجھ کو پہلے بھی اپنی زندگی پر کب اختیار تھا اسحاق!" زبیدہ نے کہا اور پھر رونے لگی۔ اسحاق نے اس کے آنسو صاف کیے۔

"چلو اٹھو، کپڑے بدلو۔" اسحاق نے کہا "ہم باہر چل رہے ہیں۔ کھانا بھی باہر کھائیں گے۔"

"او خدا! او میرے خدا!!" زبیدہ نے فرطِ جذبات سے کانپتے ہوئے کہا۔

ڈنڈا پڑتے ہی وہ بلبلا کے اچھلا اور سیدھا بیٹھ گیا "تم آدمی ہو کہ ہلاکو خان؟ شرافت سے نہیں اٹھا سکتے؟"

"شرافت کی اولاد" پولیس مین نے پھر ڈنڈا گھمایا مگر وہ پھرتی سے جمپ لگا کے پیچھے کود گیا "یہ بیڈروم ہے تیرا؟"

"او یار سنتری بادشاہ! بیڈروم ہوتا تو ہم یہاں سوتے۔ اب کہیں تو سونا ہی ہے نا" وہ مظلوم بن کے بولا۔

"دفع ہو جا ادھر سے" پولیس مین نے اسے ایک گالی دے کر کہا "کسی قبر میں جا کے مُردے کے ساتھ لیٹ جا"

"تمہارا پیارا صاحب! تمہارا گھر تو ہے نا؟ گھر کیا کوٹھی ہوگی" وہ عاجزی سے بولا "پھر ہم فقیروں سے بَیر کیسا؟ تم جاؤ اپنے عشرت کدے میں، تمہاری بیوی اکیلی ہوگی۔ تمہاری جگہ میں پہرہ دیتا ہوں، بالکل ایمانداری سے۔ ایمانداری میرا سب سے بڑا جرم ہے ورنہ معلوم ہے میں کون ہوں؟"

"ونڈے لاٹ کا پُتر ہے تو" پولیس مین نے اسے گردن سے دبوچ لیا "مجھے تڑی دیتا ہے"

"تڑی، خدا کی قسم! یہ مقصد نہیں تھا میرا۔ میں نادم ہوں" وہ منمنایا۔

"جب پکڑے جاتے ہیں تو سب یہی کہتے ہیں کہ ہم بہت نادم ہیں۔ اب تھانے میں بتانا اپنے باپ کو" سپاہی نے اس کی جامہ تلاشی جاری رکھی اور سخت مایوس ہو کے اس کی گدّی پر ایک ہاتھ مارا۔

"یہ میرا نام ہے جناب ڈی ایس پی صاحب! نادم میرا نام ہے" وہ گردن سہلا کے بولا "میں حُلیے سے مجنوں لگتا ہوں مگر میں اس شہر کے دوسرے بڑے اخبار کا نمبر ون کرائمز رپورٹر تھا مگر میں وہاں سے بھی نکالا گیا جیسے گھر سے نکالا گیا تھا۔ کیونکہ میں سچ بولنے پر اصرار کرتا تھا خواہ وہ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔ میرے سچ نے ہمیشہ گڑبڑ پھیلائی ہے"

"کتے!" سپاہی نے اس کے منہ پر ہاتھ مارا "زبان بند رکھ اپنی" پھر اس کا دوسرا ساتھی آگیا۔ وہ دونوں اسے دھکیلتے ہوئے تھانے لے گئے اور حوالات میں پھینک دیا جہاں پہلے ہی ملزمان کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کے اوپر گرا اور سوتے سے جاگنے والوں نے اس نووارد کا استقبال لاتیں مار کے اور گالیاں دے کر کیا۔

"جناب ڈی آئی جی صاحب!" نادم نے چلّانا شروع کیا "ایک کپ چائے کا تو لا دو۔ بھوکے کو مارتے رہے۔ اب

اپنے گھر لائے ہو تو چائے کو بھی نہیں پوچھتے۔ چائے نہ سہی، سگریٹ ...."

حوالات کے باہر بندوق لے کر کھڑے ہوئے سپاہی نے بندوق کا کندا سلاخوں میں ڈال کے اسے مارنا چاہا مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔"چپ کرتا ہے کہ نہیں؟" دو ہٹے کٹے حوالاتی جارحانہ عزائم لے کر اٹھے۔ وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

صبح اسے ایس ایچ او کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایس ایچ او، روایتی قسم کے تھانیدار سے بالکل مختلف ہے۔ وردی کے بجائے وہ بے حد اسمارٹ ڈریس میں تھا اور صحت مند ضرور تھا لیکن اس کی توند نہیں نکلی ہوئی تھی۔ وہ صورت سے بھی تعلیم یافتہ لگتا تھا۔"کیا جرم ہے اس کا؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"چرس پی کر دنگا کر رہا تھا سر!" سپاہی نے کہا۔

"چرس پیتے ہو یا ہیروئن؟" انسپکٹر نے نادم کو غور سے دیکھ کر کہا جس کی صورت پر نشے کے عادی افراد کی علامات نہیں تھیں۔

"کچھ نہیں۔ آپ تجربہ کار آدمی ہیں۔ میڈیکل چیک اپ کرا سکتے ہیں۔" نادم نے انگریزی میں جواب دیا۔"مجھے ایک بینچ پر سونے کے جرم میں لایا گیا ہے۔ میں بینچ کے نیچے سوتا، تب بھی یہ مجھے پکڑ لاتے۔ مجھے کہیں تو سونا ہی تھا۔"

انسپکٹر صاحب نے اسے توجہ سے دیکھا۔"تم تعلیم یافتہ آدمی ہو، گھر نہیں ہے تمہارا؟"

"کوئی گھر آدمی کا اپنا نہیں ہوتا۔" نادم بولا۔"باپ نے مجھے عاق کر دیا۔ بیوی نے مجھ سے طلاق لے لی۔ مالک مکان نے مجھے باہر پھینک دیا۔"

"تم باہر جاؤ۔" انسپکٹر نے کہا۔ سپاہی جو بوکھلایا ہوا کھڑا تھا، فوراً رخصت ہو گیا۔"یہاں بیٹھ کے بات کرو۔ تم مجھے جرائم پیشہ تو نہیں لگتے۔"

"میں بہت بڑا مجرم ہوں انسپکٹر صاحب۔" نادم ہنسا۔"کیونکہ میں سچ بولتا ہوں۔ کیا اس زمانے میں سچ سے بڑا جرم کوئی اور ہے۔ سچ پہلے بھی جرم تھا چنانچہ سقراط کو سزائے موت ہوئی، گلیلو کا سر قلم کیا گیا۔ کیا ایک پیالی چائے مل سکتی ہے مجھے؟"

انسپکٹر نے گھنٹی بجا کے ایک سپاہی کو طلب کیا اور چائے کے علاوہ اسے کچھ کھانے کے لیے لانے کا حکم دیا۔"تم دلچسپ آدمی ہو اور بہت عجیب۔ مجھے سچ بتا دو کہ تم کون ہو.... میں تمہاری مدد کروں گا اور سچ کا بالکل برا نہیں مانوں گا۔"

"پھر آپ کی تھانیداری زیادہ دن نہیں چلے گی۔" نادم نے افسوس سے سر ہلایا۔"میں نے مات کو سچ بولا تھا کہ میں ایک بہت بڑے اور معزز آدمی کا بیٹا تھا۔ سچ بولنے پر اس نے مجھے نادان اور ناخلف قرار دے کر نکال دیا۔ میں دنیا میں دھکے کھاتا رہا اور تجربات و حوادث کی شکل میں دنیا نے مجھے جو کچھ دیا، وہ دنیا کو لوٹاتا رہا۔ اخبار بیچتے بیچتے میں اخبار نویس بن گیا۔ معلوم نہیں کیوں خدا نے مجھے عقل اور قوتِ مشاہدہ دی تھی اور تھوڑی سی ذہانت بھی۔ اتفاق سے ایک رپورٹر میرا یار بن گیا۔ اس نے ذاتی کوشش سے مجھے بھی رپورٹر بنا دیا۔ جرائم کی دنیا کو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ میں مجرموں کا ساتھی تھا۔ ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ان کی مدد بھی کرتا تھا۔ مجھ سے بہتر کرائم رپورٹر کون بن سکتا تھا۔ میں نے انھی یاروں کی مدد سے مجرموں کی پشت پناہی کرنے والوں کو... بے نقاب کرنا شروع کیا۔ ایک طرف پولیس میری دشمن بن گئی، دوسری طرف وہ پردہ نشین جو سامنے آئے بغیر جرم کی کمائی سے اپنے خزانے بھرتے تھے۔ میں نے دونوں کے دباؤ میں آنے اور دونوں کی رشوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایڈیٹر نے مجھے سمجھایا کہ اس جہاد میں اخبار شہید ہو جائے گا۔ میں نے اخبار چھوڑ دیا اور شہر کے دوسرے بڑے اخبار میں چلا گیا۔ میری شہرت پبلک میں بہت زیادہ تھی چنانچہ یہ بڑا اخبار میرے سنسنی خیز انکشافات سے اپنی... اشاعت بڑھا سکتا تھا اور مجھ پر دباؤ ڈالنے والوں کا مقابلہ بھی کر سکتا تھا۔ وہاں مجھے ماہانہ تین ہزار روپے ملتے تھے، آنے جانے کا خرچ الگ۔ موٹر سائیکل، آفس میں سونے کی اجازت اور وقتِ ضرورت ادھار۔ یہ سب ملتا تھا مجھے۔ پھر شامت نے گھیرا تو میں اندرونِ ملک ڈاکوؤں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے چکر میں پڑ گیا۔ میں جان ہتھیلی پر رکھ کے خطرناک جنگلوں میں گیا اور ڈاکوؤں کے ٹھکانوں تک پہنچا جہاں پولیس کبھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں بھیس بدل کے پھرتا تھا اور بڑا اچھا اداکار بھی ہوں۔"

ایک پولیس مین نے چائے کی ٹرے اندر لا کے رکھی۔ بڑے ادب کے ساتھ چائے بنا کے ایک ایک پیالی اپنے افسر اور اس ملزم کے سامنے رکھی جس کو ایس ایچ او صاحب بھی لفٹ دینے پر مجبور نظر آتے تھے۔ پھر اس نے ایک پلیٹ درمیان میں رکھ دی جس میں آدھے پونڈ کا کیک کٹا ہوا رکھا تھا۔ جتنی دیر میں نادم نے پلیٹ صاف کی اور چائے ختم کی، انسپکٹر سگریٹ سلگائے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بہت مختلف قسم کا آدمی تھا۔ اس نے ایم اے کے بعد ایل ایل بی کیا تھا اور پولیس میں ڈائریکٹ اے ایس آئی آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا کام پولیس کے محکمے کی اصلاح نہیں ہے اور وہ خود بھی پارسائی کا دعوے نہیں کرتا تھا لیکن وہ عام تھانیداروں سے زیادہ مردم شناس تھا اور ہر کیس کو اپنی عقل و ذہانت سے حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ناجائز ظلم نہیں ہونے دیتا تھا اور بے گناہ پکڑے جانے والوں
کو چھوڑ بھی دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آوارہ گردی یا نقصِ امن جیسے
الزامات میں پکڑے جانے والے بیشتر لوگ وہی ہوتے ہیں جو
لاوارث ہوں اور اپنا دفاع نہ کر سکتے ہوں۔ کسی وزیر، سفیر یا
افسرِ اعلیٰ کے بھانجے بھتیجے نہ ہوں اور رشوت دے کر خود کو بے قصور
تسلیم کروانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ تاہم اس کی نگاہ مجرم
کو شناخت کرنے میں بہت کم غلطی کرتی تھی اور حقیقی مجرم اس
کے چنگل میں پھنس کر محض اداکاری سے اپنی جان نہیں بچا
سکتے تھے۔

"تو جناب! ایک سگریٹ کی اجازت ہے؟" نادم نے
تازہ دم ہو کے کہا اور اجازت ملنے سے پہلے ہی میز پر رکھے
ہوئے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ "میں بات کر رہا تھا
ڈاکوؤں کی۔ عوام کی قیاس آرائیاں اپنی جگہ۔ کچھ اسے سیاسی
مسئلہ کہتے تھے، کچھ انتظامی اور پولیس کا نقطۂ نظر الگ۔ میں
نے ذاتی طور پر جو کچھ معلوم کیا، اسے ایک فیچر کی صورت میں
مرتب کر کے ایڈیٹر کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں جو کچھ لکھا تھا،
اس کا ثبوت بھی تھا، تصویروں کی صورت میں اور ٹیپ کی
آوازوں میں۔ ایڈیٹر نے یہ سب کچھ دیکھا تو اس کے ہاتھوں
کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے مجھے بند کمرے میں بیٹھ کے سمجھایا
کہ یہ سب ناقابلِ اشاعت ہے کیوں کہ یہ بہت بڑا سچ ہے
اور اتنے بڑے سچ پر اتنے بڑے نام آتے ہیں کہ اس فیچر
کی اشاعت کے بعد نہ اخبار رہے گا اور نہ اس کا ناشر اور ایڈیٹر۔
اس نے کہا، ہم جس دریا میں رہتے ہیں اس میں ایسے بہت
سے مگرمچھ ہیں۔ ان سب سے بیر ناممکن ہے۔ یہ ٹھیک
ہے کہ تم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے مگر تم نے ہم
سب کے انجام کو نظرانداز کر دیا ہے۔ یہ بہت بڑے ڈاکو ہیں۔
تم نے ان کے ہر گروہ کا سُراغ لگایا ہے، ان کی سرگرمیوں کا
مقصد معلوم کر لیا ہے، ان کی پشت پناہی کرنے والوں کا بھی
پتا چلا لیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ پولیس ان پر کیوں ہاتھ نہیں
ڈالتی اور ان کے اصل عزائم کیا ہیں۔ تم نے پولیس مقابلوں
کا پول بھی کھول دیا ہے لیکن خدا کے واسطے یہ سب کچھ جلا
دو، ضائع کر دو۔ مجھے اپنا اخبار اور اپنے اثاثے ہی نہیں،
اپنی زندگی اور اپنے بیوی بچوں کا مستقبل بھی عزیز ہے۔ اپنی
سرگرمیوں کو مقامی جرائم تک محدود رکھو۔ قومی یا بین الاقوامی
پیمانے پر ہونے والے جرائم کے چکر میں مت پڑو۔ کیا امریکا
میں کوئی اتنا طاقتور رہے کہ مافیا کا مقابلہ کر سکے؟ وہ سب
سچ تھا مگر اخبار کے مالک کو زندہ رہنا تھا اور اپنا اخبار بیچنا
تھا چنانچہ اس نے میرے احتجاج کی پروا نہیں کی اور وہ سب کچھ
ضائع کر دیا جو میں نے تین مہینے میں معلوم کیا تھا۔ میں نے اسی
وقت اخبار کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد مجھے کسی اخبار کے دفتر میں
فرش صاف کرنے تک کی نوکری نہ ملی۔ میں سیلز مین بن گیا مگر
ناکام رہا کیونکہ میں مٹی کو سونا کہہ کے نہیں بیچ سکتا تھا۔ معلوم
نہیں اس بیسویں صدی میں مجھے پیدا ہونے کی ضرورت ہی
کیا تھی اور اگر یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی تو مجھے ضمیر کو بہرحال
قتل کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے دس جگہ قسمت آزمائی کی اور
ضمیر نے ہر جگہ مجھے ذلیل کیا۔ جوتے مار کے نکلوایا۔ رات میں
حوالات میں عام مجرموں کے درمیان تھا۔ اب مجسٹریٹ کے
سامنے پیش کیا جاؤں گا اور وہ میری ایک نہیں سنے گا کہ میں
نے چرس نہیں بیچی، ہیروئن فروخت نہیں کی۔ یہ سب تو
میرے پاس سے برآمد ہو جائے گا تھانیدار صاحب! پھر وہ
کیوں پوچھے گا مجھ سے مگر مجھے پروا نہیں۔ جیل خانہ ہو یا پاگل خانہ،
میرے لیے تو اندر باہر سب ایک ہی ہے۔"

"یو آر رانگ۔" انسپکٹر مسکرایا۔ "میں تمھیں ضمانت دیتا
ہوں کہ تمھیں عدالت سے سزا نہیں ہو گی۔ کیا نام ہے تمھارا؟"
"میں نادم ہوں۔" وہ سگریٹ بجھاتے ہوئے بولا۔
انسپکٹر ہنسا۔ "نہیں بھئی! میں نادم ہوں۔ ایک رات
تم کو جو تکلیف اُٹھانی پڑی مگر یہ نظام ہی ایسا ہے اور میں
اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں۔ یوسی! میں نے تمھارے
سچ کا برا نہیں مانا اور اس پر یقین بھی کیا۔"

اسحاق کے لیے کسی بھی عدالت میں بغیر کسی وجہ کے جانے
سے کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ اس کے آشنا ہر جگہ موجود تھے
وہ کسی بھی اے سی ایم یا ایس ڈی ایم کی کورٹ میں پیش ہونے
والے ملزمان کے خلاف سماعت کی کارروائی میں حصہ لیے بغیر بھی
وہاں موجود رہ سکتا تھا۔ آتے جاتے وکلا اس سے خیریت پوچھتے
تھے اور رسمی سلام دعا کے بعد نکل جاتے تھے۔ عدالتوں کے اژدہام
میں کسی کو بھی کسی سے سروکار نہ تھا۔ وکیل اور مؤکل اپنے اپنے
مقدمات کی دُھن میں ایک عدالت سے دوسری عدالت میں چکر
لگاتے رہتے تھے۔ کالے کوٹوں اور سوٹوں میں ملبوس، اپنے
بریف کیس اٹھائے اور زیرِ سماعت مقدمے کی فائل دبائے۔ ہدایات
دیتے، بحث کرتے اور ملزموں یا گواہوں کے بیانات تیار کرتے۔
یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ نجی مصروفیات کی اُلجھنوں میں اسحاق کی
پریکٹس کو کتنا دھچکا پہنچا ہے اور اس کی فرم سے علیحدہ ہونے
والے وکیلوں کی زبانی مختلف داستانیں آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھیں

مگر سوائے حاسدوں کے ابھی تک کسی نے بھی افواہوں کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا تھا۔ اسحاق کے دوست اور چاہنے والے زیادہ تھے۔ جن کو افسوس تھا کہ اچھا خاصا شہرت یافتہ، ذہین اور روشن مستقبل کا مالک اسحاق دیکھتے دیکھتے گمنام ہو گیا۔ اس کی پریکٹس کے ختم ہونے کی خبر عام تھی مگر اس کے مالی حالات کی ابتری کا علم سب کو نہیں تھا۔ بیشتر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ گمنامی کا یہ وقفہ عارضی ہے اور جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے، اسحاق اپنا کھویا ہوا مقام پھر حاصل کر لے گا۔ کیونکہ اس میں صلاحیت ہے اور لگن سے وہ محنت کرتا ہے اور ذہین ہے۔ موقع ملنے پر اس نے زیادہ بے تکلف دوستوں کے حلقے میں اپنے اور زبیدہ کے کراچی جانے کا ذکر ضرور کیا۔ تاکہ یہ بات ان کی زبانی اور لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے۔ اس نے مہینے بھر کے لیے ساحلِ سمندر پر ایک کاٹج لینے اور وہاں صرف آرام کرنے کے پروگرام کا حوالہ بھی دیا۔ یہ بھی بتایا کہ سب انتظام کس ٹریول ایجنٹ نے کیا ہے اور اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ واپسی پر وہ نئے سرے سے اپنی جدوجہد شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اپنے مقصد میں اسے تیسرے دن کامیابی حاصل ہوئی جب اس نے عدالت میں پیش کیے جانے والے ایک ملزم کو ضامن نہ ہونے کے باعث واپس جاتے دیکھا۔ وہ آوارہ گردی کے الزام میں پکڑا گیا تھا اور اسے عدالت نے پانچ ہزار روپے نیک چلنی کی ضمانت داخل کرنے کو کہا تھا۔

"میرا ضامن خدا کے سوا کوئی نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب۔" اس نے چلا کے کہا تھا۔

"کیوں، تمہارے گھر والے نہیں ہیں؟" مجسٹریٹ نے سوال کیا۔

"گھر والے اس کے ہوتے ہیں جس کا گھر ہو جناب والا!" اس نے ہنس کر کہا۔

"تمہارا کوئی گھر نہیں ہے تو رہتے کہاں ہو؟" مجسٹریٹ نے سوال کیا۔

"کھلے آسمان کے نیچے مائی باپ، خدا کی بنائی ہوئی زمین پر۔" وہ بولا۔ "کل رات ایک خالی بینچ پر سو رہا تھا کہ پولیس والے جگا کے لے گئے۔ باقی آدھی رات حوالات میں گزری۔ کل بڑے گھر چلے جائیں گے۔" کچھ لوگ مسکرانے لگے۔

"میں تم کو نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر سکتا ہوں۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "کیونکہ اس سے پہلے پکڑے نہیں گئے ہو۔ کل تک انتظام کر لو پانچ ہزار کی ضمانت کا۔"

"سارا انتظام تو وہ نیلی چھتری والا کرتا ہے جناب!" وہ انگلی اوپر اٹھا کے بولا۔

"تو آج رات حوالات میں دعا مانگتے رہنا کہ وہ کسی فرشتے کو ضامن بنا کے بھیج دے۔" مجسٹریٹ نے اس کے نیم سنجیدہ لہجے پر خفگی سے کہا۔ "ورنہ کل میں جیل بھیج دوں گا۔ سمجھے؟" اس نے فائل پر کچھ لکھا اور اپنے ریڈر کو پکڑا دی۔ ریڈر نے اس کے سامنے دوسری فائل رکھ دی اور دو پولیس والوں نے پہلے ملزم کو پیچھے کھینچ لیا۔ اسحاق چکر لگا کے دوسری طرف پہنچا۔ جہاں ایک اے ایس آئی سخت بیزاری کے عالم میں اس روزمرّہ کی کارروائی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

"کیا واقعی یہ شخص آوارہ گردی میں گرفتار ہوا تھا؟" اسحاق نے کہا۔ اے ایس آئی نے محض اقرار میں سر ہلایا۔

حلیے سے وہ سچ مچ دیوانہ نظر آتا تھا۔ لمبے لمبے بال، میلے کپڑے جو شاید مہینہ بھر پہلے دھو کر پہنے گئے تھے۔ وہ خود بھی شاید اسی دن نہایا ہو گا جب کپڑے پہنے تھے۔ اب تو اس کی شیو تین دن کی بڑھی ہوئی لگتی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ اس نے ایک ہفتے سے ہاتھ منہ نہیں دھویا۔ وہ دبلا پتلا اور کمزور سا آدمی تھا۔ جس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے سختیٔ حالات اور فاقہ کش زندگی کی خبر دیتے تھے۔ وہ بہت گھٹیا قسم کے سگریٹ پی رہا تھا اور ایک بار تو اس نے کسی سپاہی سے مانگ کر آدھی سگریٹ بھی پی لی تھی۔ اس کے حالات اسحاق کی ضروریات کے تقاضوں کے عین مطابق تھے لیکن اس سے زیادہ قابلِ غور ملزم کی جسمانی ساخت تھی۔ وہ قد و قامت میں بالکل اسحاق کے برابر تھا۔ اسحاق کی طرح اس کا رنگ بھی گندمی تھا اور اس کے بال کافی حد تک اسحاق کے بالوں جیسے تھے۔ تھوڑا سا حلیہ ٹھیک کرنے اور جسمانی صحت کے کچھ بہتر ہو جانے کے بعد وہ اسحاق بن سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس کا چہرہ بدل دیا جائے۔ اپنا چہرہ اس کے جسم پر لگانے کی کوئی صورت نہیں تھی اور پلاسٹک سرجری یا میک اپ سے کوئی چہرہ مستقل طور پر اسحاق کا نقشِ ثانی نہیں بنایا جا سکتا تھا لیکن چہرہ اس حد تک ضرور بگاڑا جا سکتا تھا کہ تصوّر کی مدد سے بھی تصویر نہ بنائی جا سکے۔ اسحاق نے محسوس کیا کہ اس بے گھر اور لاوارث ملزم نے اگر اسحاق کے کپڑے پہن رکھے ہوں، اس کے ہاتھ کی ایک انگلی میں اسحاق کی منگنی کی انگوٹھی ہو اور ایک کلائی میں اسحاق کی قیمتی رسٹ واچ ہو، پھر لاش کی جیب سے برآمد ہونے والے کاغذات ثابت کرتے ہوں کہ وہ اسحاق ایڈووکیٹ تھا اور اس پر زبیدہ کی شناخت مُہرِ تصدیق ثبت کر دے تو مسخ شدہ چہرے کے بارے میں کون... شک کر سکتا ہے کہ مرنے والا اسحاق نہیں تھا۔

اسحاق کو معلوم تھا کہ عدالت کا وقت ختم ہونے تک یہ کچھ لوگ ضمانت پر رہا ہو جائیں گے، کچھ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل چلے جائیں گے اور باقی اپنے اپنے تھانوں کی حوالات میں پہنچیں گے۔

اس کے منصوبے کا ایک اور مرحلہ کامیابی سے طے ہوتا نظر آتا تھا۔ اس نے گھر واپس پہنچنے کے بعد زبیدہ سے بات کی۔ گزشتہ تین دن میں اسحاق نے اپنے رویے سے زبیدہ کو کافی حد تک قائل کر لیا تھا کہ وہ ازدواجی زندگی کے ایک نئے دور کے آغاز کے معاملے میں مخلص ہے۔ حالات کے باعث وہ اپنی شخصیت اور اپنا پیشہ بدلنے پر مجبور ہے مگر مستقل کے بارے میں اس کا پلان مکمل ہے۔ اس نے زبیدہ کو اتنی تفصیل سے ہر بات سمجھائی تھی کہ... زبیدہ کے لیے شک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی اور اسے یقین آ گیا تھا کہ اب ان کے لیے لاہور چھوڑ کے کراچی منتقل ہو جانے میں ہی عافیت ہے۔ بارہ چودہ لاکھ کی رقم کسی بھی کاروبار میں لگانے سے معقول آمدنی یقینی تھی۔ اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کا شوہر زاہد اسحاق ایڈووکیٹ ہو یا کوئی بزنس مین جس کا نام بھی مختلف ہو۔ ہوگا تو وہ ایک ہی آدمی جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا۔ اب تک وہ اس کا شوہر نہ تھا مگر نام بدلنے کے بعد وہ صرف اس کا شوہر ہونے والا تھا اور زبیدہ کے لیے یہی تقدیر کا سب سے بڑا احسان تھا۔

اس رات زبیدہ پولیس اسٹیشن پہنچی تو نادم حوالات میں دوسرے ملزموں کے ساتھ سمٹ کر سویا ہوا تھا۔ ایس ایچ او کی مہربانی سے اس کو نہ ڈرائنگ روم لے جایا گیا تھا اور نہ بھوکا رکھا گیا تھا۔ اسے چائے بھی ملی تھی اور سگریٹ بھی۔ رائفل لے کر اسٹول پر بیٹھے ہوئے سنتری نے (جو ضرورت مند اور معاوضہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ملزموں کو چرس بھی فراہم کرتا تھا) نادم کو بیدار کیا اور سلاخوں والے دروازے کا قفل کھولا۔

"چلو شہنشاہو!" سنتری نے کہا۔ "بے بے آئی ہے تمھاری۔"

"تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" نادم نے پھر سونے کی کوشش کی۔ "میرا کوئی ملنے والا یہاں نہیں آ سکتا۔"

"اوئے چل۔" سنتری نے اسے باہر کھینچ لیا۔ "چل کے دیکھ انچارج صاحب کے کمرے میں بیٹھی ہے غلط فہمی۔"

"تمھارا مطلب ہے کوئی عورت ہے؟" نادم نے مزید حیرانی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ زنانی ہے کوئی۔ تیری گھر والی نہیں ہے۔"

انچارج کے کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ دم بخود رہ گیا۔ اندر ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔ وہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن جاذب نظر ضرور تھی۔ شباب کی دلکشی کے علاوہ اس کے لباس کے حسن نے اور سلیقے سے کیے ہوئے میک اپ نے، اس کے جدید ہیر اسٹائل نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر میں خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ نادم کو دیکھ کر وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی۔

کمرے میں اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔

"میں نادم ہوں۔" اس نے حسب عادت اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے ملنے آئی ہیں آپ؟"

"جی، اس میں نادم ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "نادم صاحب! تشریف رکھیے۔"

"غالباً میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" نادم نے کرسی پر بیٹھ کے کہا۔

"دیکھا تو میں نے بھی آپ کو ابھی ہے۔" زبیدہ نے کہا۔ "لیکن آپ کے بارے میں کسی ذریعے سے مجھے یہ خبر مل گئی تھی کہ آپ کو آوارہ گردی میں پکڑ لیا گیا ہے اور آپ کی ضمانت نہیں ہو سکی۔"

"یہ تو کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہر روز تھانے میں میرے جیسے بے گھر اور لاوارث ایسے ہی لائے جاتے ہیں جن کا ضامن خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔" نادم نے کہا۔ "اور خدا کی ضمانت کو عدالت قبول نہیں کرے گی۔"

"میں آپ کے لیے نقد پانچ ہزار روپے کی ضمانت فراہم کرنے آئی ہوں۔" زبیدہ نے کہا۔

"بطور خاص میرے لیے؟" نادم نے اسے غور سے دیکھا۔ "میرے ہی حال پر یہ مہربانی کیوں؟ یا آپ کی یہی ہابی ہے؟"

"میں صرف آپ کے لیے ضامن بن کے آئی ہوں۔" زبیدہ نے کہا۔ "کیا آپ رہا ہونا نہیں چاہتے؟"

"چاہتا تو ہوں مگر آپ بھی کسی وجہ کے بغیر تو پانچ ہزار خرچ نہیں کر رہی ہیں نا؟" نادم بولا۔

"مجھے پیسے کی کمی نہیں۔" زبیدہ نے کہا۔

"وہ تو میں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ غریب نہیں ہیں۔" نادم بولا۔ "لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔"

"مسٹر نادم! آپ کا اندازہ درست ہے، میں بلاوجہ پانچ ہزار روپے نہیں پھینک رہی ہوں۔" زبیدہ نے کہا۔ "مجھے بھی آپ سے ایک کام ہے لیکن اس کام کی نوعیت میں یہاں اور اس وقت نہیں بتا سکتی۔"

"آپ کو کیوں یقین ہے کہ میں وہ کام کر سکتا ہوں اور ضرور کروں گا؟" نادم نے کہا۔ "ہو سکتا ہے آپ کے یہ پانچ ہزار ضائع ہو جائیں۔"

"یہ تو میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا ہے۔" زبیدہ نے کہا۔ "اس میں نقصان بھی ہو سکتا ہے مجھے۔ میں پانچ ہزار کا نقصان برداشت کر لوں گی لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تمھیں اس کام کے بدلے بہت دولت ملے۔"

"آپ کو میرے پاس بھیجنے والا کون ہے؟" نادم نے

بیوقوفوں کی طرح کہا۔

"اب میں کچھ نہ بتاؤں گی۔" زبیدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کل عدالت میں ملاقات ہوگی اور جب تم رہا ہو جاؤ گے تو ہم کسی شریفانہ جگہ پر بیٹھ کے تفصیلی گفتگو کریں گے۔ خدا حافظ۔" اسحاق کے کچھ کہنے سے پہلے وہ رخصت ہوگئی۔

اسحاق بھونچکا بیٹھا رہ گیا۔ یہ خیال اسے واپس حوالات کی سلاخوں والی متعفن اور تنگ کوٹھری میں بند ہونے کے بعد آیا کہ دس منٹ گفتگو کرنے کے باوجود اس نے عورت کا نام تک نہیں پوچھا۔ واہ! نیلی چھتری والے۔ میں نے تو دُعا تک نہیں مانگی تھی۔ مجسٹریٹ صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ سچ مچ خدا نے ایک فرشتہ بھیج دیا ہے۔ یہ تو اس عورت نے تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی نیکی راہِ خدا میں نہیں ہے۔ کسی جان پہچان اور حوالے کے بغیر وہ نادم کی مدد کر رہی تھی تو اس کا دوسرا مطلب یہ نکالا جاسکتا تھا کہ اسے بھی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ مدد کیا ہوسکتی ہے؟

نادم نے غور کرنا شروع کیا۔ کام یقیناً کوئی غیر معمولی ہوگا ورنہ وہ معاوضے کی بات نہ کرتی۔ یہ نہ کہتی کہ تمھیں بہت دولت ملے گی۔ پانچ ہزار تو وہ ایسے ہی محض حرفِ تمہید کے طور پر نادم سے تعارف کی خاطر دے رہی ہے۔ اصل کام بعد میں بتائے گی اور وہ صاف کہہ چکی ہے کہ اسے نقصان کی پروا نہیں۔ اتنی دولت کوئی عورت کب خرچ کرتی ہے؟ جب وہ کسی انتہائی سنگین مسئلے سے دوچار ہو، اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو یا عزت کو۔ نادم کے ذہن نے ان گنت امکانات کو مدِّنظر رکھا۔ ممکن ہے، وہ کہے کہ میرا باپ میری شادی ایک بڈھے سے کر رہا ہے اور میں ایک ہینڈسم ہیرو پر مرتی ہوں لیکن اس سے شادی کروں تو باپ کی دولت جاتی ہے چنانچہ تم اس بڈھے کو قتل کر دو یا میرے باپ کو۔ ظاہر ہے، پھر وہ باپ کی دولت کی مالک ہوگی تو خیرات مجھے بھی بخش دے گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے کسی گناہ کا پھندا میرے گلے میں ڈالنا چاہتی ہو۔

"سنتری بادشاہ!" نادم نے اسٹول پر جمائیاں لینے والے کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔ "یار! یہ دولت کیا ہوتی ہے؟"

سنتری کا منہ کھلا رہ گیا۔ دولت کا لفظ تو اس نے بھی ہزار بار سُنا تھا مگر اس قسم کا سوال نہیں سُنا تھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کتنا پیسہ ہو تو اسے دولت کہتے ہیں؟" نادم نے کہا۔ "دس بیس ہزار، پچاس ہزار۔"

"پچاس ہزار!" سنتری نے غور کرنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ "آج کل پچاس ہزار کیا ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا مکان بھی نہیں بنتا۔ بیٹی کی شادی پر میرا خرچہ اس سے زیادہ بیٹھ گیا تھا۔"

"اچھا! اور کوئی بیٹی ہے تمھاری؟" نادم نے کہا۔ "نقد دیا تھا یا جہیز کی صورت میں؟"

سنتری کا موڈ آف ہوگیا۔ اس نے نادم کو عام فہم زبان میں گالیاں دیں مگر یہ تھانے کی مادری زبان تھی۔

"یار! ہم رہا ہونے والے ہیں اور دولت مند بھی ہونے والے ہیں۔" نادم نے کہا۔ "لیکن دولت ہمارے سائے سے بھاگتی رہی ہے، اس لیے اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے ہماری کون سی نیکی کو قبول کر لیا ہے۔ تم نے کبھی غلطی سے کوئی نیکی کی ہے؟"

اگلے دن وہ ضمانت پر رہا ہو کے نکلا تو زبیدہ اپنی مرسڈیز میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھا مگر وہ خالی تھا۔

"عجیب خدا کی قدرت ہے۔" وہ بولا۔ "آج مجھے جانا تو جیل تھا مگر جا رہا ہوں میں اس شاہانہ کار میں۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم کہیں بیٹھ کے بات کریں۔" زبیدہ نے مسکرا کے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "اور بہتر ہے کہ کہیں کھانا کھائیں۔"

"اس حلیے میں؟" نادم بولا۔ "لوگ سمجھیں گے، آپ ثواب کی خاطر کسی فقیر کو کھانا کھلانے لائی ہیں۔"

"تو پہلے ایسا کرتے ہیں کہ تمھارے لیے مناسب کپڑوں کا انتظام کر لیتے ہیں۔" زبیدہ بولی۔ "ان کو ایک تحفہ سمجھ کے رکھ لینا، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارا سودا نہ ہوسکے۔"

"آپ میری کون سی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہیں آخر؟" نادم نے کہا۔ "اور آپ کی مجبوری کیا ہے؟"

"میں کوئی غلط قسم کی عورت نہیں ہوں لیکن ایک مصیبت میں گرفتار ہوں۔" زبیدہ نے کہا۔ "یہی وہ مجبوری ہے جس نے مجھے تمھارے پاس آنے پر مجبور کیا۔ میں اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گی جس نے مجھے تمھارا نام بتایا تھا۔"

"چلو اپنا نام تو بتا دو۔ کل میں بھول گیا تھا۔" نادم نے کہا۔

"میرا نام پہلے زبیدہ افتخار تھا۔ پھر زبیدہ اسحاق ہوگیا۔" وہ بولی۔ "زاہد اسحاق میرے شوہر کا نام ہے۔"

"کون زاہد اسحاق؟ وہ وکیل تو نہیں ہیں؟" نادم نے ذہن پر زور دے کر کہا۔

"ہاں، وہی زاہد اسحاق۔" زبیدہ بولی۔ "میں تم سے صاف بات کروں گی۔ سودا کچھ بھی ہو، اگر اس کا معاوضہ اتنا ملے کہ تمھارے سارے مسائل حل ہو جائیں اور تم کو مکمل تحفظ کی ضمانت بھی فراہم کی جائے تو تم میرا کام کرو گے؟"

نادم اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ بالکل پُرسکون تھی اور اگر اس کے عزائم مجرمانہ تھے تو اس کا اظہار نہ زبیدہ کے رویّے سے ہوتا تھا اور نہ چہرے سے۔ تحفظ کی ضمانت کے ساتھ دولت۔ سارا

کھٹکا خطرے کا تھا مگر زبیدہ نے یہ ڈر بھی دُور کر دیا تھا۔ دال میں کچھ نہ کچھ کالا تو تھا مگر نادم کا ذہن اس کا اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ "کام کیا ہے آخر؟" نادم بولا۔

"کام بھی بتا دوں گی میں، اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چنانچہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" زبیدہ نے کہا۔ "دولت تمھاری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ شاید زندگی میں ایسی لاٹری پھر تمھارے نام نہ نکلے۔ ہمت ہے تو کہو۔"

"ہمت تو ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھے قدرت نے کبھی موقع فراہم نہیں کیا۔ نہ کبھی پرائز بونڈ کا انعام نکلا، نہ کسی ریفل ٹکٹ کا۔" نادم بولا۔ "اور میں نے دنیا میں جھک مار کے یہ سبق سیکھا ہے کہ دولت صرف انھی کے پاس آتی ہے جن کے پاس پہلے ہی دولت کی کمی نہ ہو۔ پیسہ واقعی پیسے کو کھینچتا ہے مگر کھینچنے والے پیسے میں طاقت ہونی چاہیے۔ سو دو چار سو یا دو چار ہزار کی طاقت تو اس ریلوے انجن کی طرح ہوتی ہے جس کے پیچھے بائیس بوگیاں مسافروں سے کھچا کھچ بھر کے لگا دیتے ہیں۔ یہ سیٹھ ساہوکار اور صنعتوں کے مالک ایک سے دوسرا کارخانہ لگاتے چلے جاتے ہیں۔ ایک کاروبار سے دوسرا کاروبار شروع کر کے گروپ آف کمپنیز بنا لیتے ہیں۔ دو چار ہزار والا تو نون، تیل، لکڑی کے چکر سے ہی نہیں نکل پاتا۔"

"اگر تمھارے پاس واقعی دولت ہو تو تم اور دولت کما لو گے۔ صلاحیت ہے تم میں۔" زبیدہ ہنسی۔

"ہاں۔ ایک لاکھ کے دو لاکھ اور دو کے چار بنانے میں کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔" نادم نے کہا۔ "مگر وہ جو ایک انڈے سے پولٹری فارم، پولٹری فارم سے ڈیری فارم اور ڈیری فارم سے فارم بنانے پھر جاگیردار، صنعت کار اور ملک التجار ہونے کے خواب دیکھتا ہے، اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ انڈا کھائے۔ ایک لاکھ سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے ابھی طے تو نہیں کیا، کیونکہ ایک لاکھ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔"

گاڑی اچانک رُک گئی۔ "میرے ساتھ آؤ اور اپنا لباس خود پسند کر لو۔" زبیدہ نے کہا۔

شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں وہ زبیدہ کے ساتھ یوں داخل ہوا کہ ہر نظر اس کی طرف اٹھی۔ شاید زبیدہ کے نوکر بھی اتنے غلیظ حلیے میں نہیں پھرتے ہوں گے مگر اس کے باوجود منیجر سے سیلز مین تک سب نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ زبیدہ کی پذیرائی کی اور نادم نے محسوس کیا کہ وہ سب پہلے سے زبیدہ کو جانتے ہیں۔

"صاحب کو مردوں کے ریڈی میڈ گارمنٹس سیکشن میں لے جاؤ اور ان کو سوٹ پسند کرنے دو۔ قمیص اور ٹائی سے جوتے تک۔" زبیدہ نے کہا۔ "یہ لباس بدلیں گے۔ ان کے پرانے کپڑے پیک کر دو۔"

"یس میڈم۔" ایک سیلز مین نے کہا۔

جب نادم ڈریسنگ روم سے لباس بدل کے نکلا تو اس کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ زبیدہ ایک کشن پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی اور کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ اس نے نادم کو ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔ ایک بار پھر نادم نے نوٹ کیا کہ زبیدہ کوئی اجنبی نہیں ہے کیونکہ منیجر نے اس کو بل پیش نہیں کیا تھا۔ وہ ان معزز گاہکوں میں سے تھی جن کی ماہانہ خریداری کا بل ایک ہی بار اُن کے گھر ارسال کر دیا جاتا ہے اور وہ صرف ٹوٹل پر نگاہ ڈال کے چیک کاٹ دیتے ہیں۔ ان کے لیے کسی بھی وقت اسٹور سے کوئی بھی چیز اُٹھا کے لے جانے پر پابندی نہیں ہوتی اور خریداری کے لیے ان کا کریڈٹ کارڈ بھی چلتا ہے، کریڈٹ بھی۔ راستے میں گاڑی ذرا سی دیر کے لیے پھر رُکی۔ زبیدہ گاڑی میں ہی بیٹھی رہی اور نادم شیو بنوانے، بال کٹوانے اور غسل کرنے کے بعد لوٹا تو پہچانا نہیں جاتا تھا۔

"تم تو بے حد ہینڈسم ہو۔" زبیدہ نے کہا۔ "میں پہلے سے شادی شدہ نہ ہوتی تو تم پر مرمٹتی۔"

نادم ہنسا۔ "کیا تمھارے شوہر نے بھی تم پر مرمٹنے کی.. پابندی لگا رکھی ہے؟ جذبات پر یہ پہرے بٹھانا مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"تم اجازت دو گے اپنی بیوی کو کہ وہ جسے پسند کرے اس کے ساتھ چلی جائے۔"

"ہاں، دیکھو نا جب میری بیوی مجھ سے نفرت کرنے لگے تو میں بزورِ بازو اس کو ساتھ تو رکھ سکتا ہوں مگر اس کی محبت حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسے قانونی یا معاشرتی حقوق سے فائدہ اُٹھا کے مجھے کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔" وہ بولا۔

"خیر، مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔" زبیدہ نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ کھانا کہاں کھائیں؟"

"ارے بابا! فقیر کو اور شرمندہ مت کرو۔ یہ سوال تو مرد کرتے ہیں مگر مرد طفیلی ہوں تو پھر عورت کو پوچھنا بھی نہیں چاہیے۔ میں تو کھاتا تھا کیفے ڈی فٹ پاتھ پہ۔" نادم بولا۔ "تم کو عادت ہو گی فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ڈائننگ ہال کی۔"

نادم کا ذہن شدید اُلجھن کا شکار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا

تھا کہ آخر ایک اجنبی عورت یکلخت اس پر اتنی مہربان کیوں ہوگئی ہے۔ اخلاقاً ابھی تک نادم نے اقرار یا انکار کے نتائج کی ذمّے داری قبول نہیں کی تھی چنانچہ وہ تقدیر کی اس عنایت کو ٹھکرانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ اس کے اختیار میں تھا کہ وہ کھانا کھا کے شکریہ ادا کر کے... روانہ ہو جائے لیکن اب اس کا تجسّس بیدار ہو گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس عورت نے جو ذرا بھی ذہنی مریض نہیں لگتی تھی اسے پستیٔ زنداں سے اُٹھایا ہے تو کہاں گرانے کے لیے۔ کام کی نوعیت ہنوز ایک رازِ سربستہ تھی لیکن وہ کئی بار یقین دلا چکی تھی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں اور اسے دولت ضرور ملے گی۔ دولت کی اسے سخت ضرورت تھی کیوں کہ وہ تمام عمر فاقہ کشی کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے "آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی" کے فلسفے نے اسے بے انتہا نقصان پہنچایا تھا اور یہ بات بالآخر اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ دُنیا میں جینے کے لیے دولت سب سے اہم چیز ہے، اصولوں اور رشتوں سے بھی زیادہ۔ آدمی ٹھوکریں کھا کے ہی سیکھتا ہے۔ اس نے بھی صرف ایک بار ملنے والی زندگی کے رائیگاں جانے سے پہلے دوسرے فلسفے کی صداقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔" مگر عیش کے لیے کیش درکار تھا جو لاٹری یا ڈاکا ڈالے بغیر نہیں ملتا تھا۔ ڈاکا ڈالنا اس کی ہمّت سے باہر تھا اور لاٹری اسے اپنی قسمت میں نظر نہ آتی تھی چنانچہ اب وہ سوچے سمجھے بغیر گھر آئی لکشمی کو دھتکارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا بشرطیکہ اس کی ذات محفوظ رہے اور دولت کا انبار اتنا ہو کہ ضمیر کی آواز کو دبا سکے۔

"بات بہت عجیب ہے۔ الفاظ نہیں مل رہے ہیں مجھے۔" زبیدہ نے ایک نیم تاریک، نیم روشن ریسٹورنٹ کے گوشے کی خلوت میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "لیکن میں تم سے سچ بولوں گی۔ تم کو تصدیق کا حق حاصل رہے گا اور سوچنے کا وقت بھی ملے گا۔ فیصلہ تم اپنی مرضی سے کرو گے۔ کسی دباؤ کے تحت نہیں، انکار کی صورت میں یہ راز ہمارے درمیان محفوظ رہے گا۔"

"تم بہت معقول طریقے سے بات کرتی ہو اور اچھّی عورت ہو۔" نادم نے کہا۔ "عاشق تو میں ہر اچھی صورت پر ہو جاتا ہوں لیکن افسوس ہے کہ تم پر نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟ کیا میں بہت بدصورت ہوں؟" زبیدہ نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بات صورت کی نہیں، تم خود بہت خوبصورت ہو۔ ہر حسین چہرہ رکھنے والی عورت خوبصورت نہیں ہوتی۔" نادم نے کہا۔

زبیدہ کے دل میں سُلگنے والے ارمانوں کی ناآسودہ آتشِ خاموش سے یوں غبار اٹھا جیسے کسی نے انگاروں پر پانی چھڑک دیا ہو۔ وہ عورت تھی جس کے وجود میں چاہنے اور چاہے جانے کی تمنّا کو دستِ خالق نے اس مٹی میں شامل کر دیا تھا جس سے عورت کا خمیر اٹھا تھا لیکن وہ بادل کی دید کے منتظر صحرا کی طرح پیاسی تھی۔ یہ الفاظ اس شخص کے لبوں پر کبھی نہ آئے تھے جسے زبیدہ نے اپنی دنیا و عافیت اور اپنا جسم و جاں سب کچھ سونپ دیا تھا۔ یہ محبت نہ تھی جس نے اسحاق کو زبیدہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا تھا۔ یہ اس کی دولت تھی جس کو اسحاق نے اپنی دسترس میں جانا تھا اور اس دولت کی سب سے ناپسندیدہ شرط کو بادلِ ناخواستہ قبول کر لیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ زبیدہ اور اس کے باپ کو زندہ اور ہوش مند انسانوں کی دنیا میں زیادہ دن تو نہیں گزارنے ہیں لیکن گیارہ سال گزر گئے تھے اور محبت کے دو بول سننے کے لیے انتظار کرتے کرتے زبیدہ کے اندر کی عورت کا وجود پتھر ہو گیا تھا۔ ابھی ابھی اسے احساس ہوا تھا کہ ایک مرد نے بالآخر اس عورت کے حُسن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور پیار بھرے لفظوں کے جادو سے وہ پتھر پھر زندگی پانے لگا ہے جو زبیدہ کے پیکر میں زندہ نظر آتا تھا۔ وہ شباب کے اوّلین جذبات سے آشنا ہونے والی نوعمر لڑکی نہیں تھی۔ وہ مرد کی نگاہ پہچانتی تھی اور اسے یوں لگا تھا جیسے نادم نے عرضِ مدعا کر دیا ہے، اظہارِ تمنا کر دیا ہے اور اپنا رازِ دل افشا کر دیا ہے۔ اس کا یہ شبہ بے سبب نہیں تھا۔ چاہت جب دل میں انگڑائی لیتی ہے تو ہر جذبہ آنکھوں میں رنگ بن کے اُترتا ہے اور تمام آرزوؤں کی منہ بولتی تصویر بن جاتا ہے۔

"تم ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" نادم بولا۔ "میں نے کوئی جھوٹ تو نہیں بولا۔"

"معلوم نہیں۔" زبیدہ چونکی۔ "دراصل میں اب اس مقام پر ہوں جہاں سچ بھی مجھے جھوٹ ہی لگتا ہے۔ میں جانتی ہی نہیں کہ سچ کیا ہے۔"

"لیکن تم کو سچ تو بتانا پڑے گا کہ مجھ پر اس عنایتِ خسروانہ کا مطلب کیا ہے؟" نادم بولا۔

"یہ سچ بہت عجیب ہے۔" زبیدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے تم کو جھوٹ لگے مگر تمھیں تصدیق کا اختیار ہے۔ جس طرح چاہو، خود کو مطمئن کر لینا۔ میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ کوئی احسان نہیں تھا۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت تھی۔ تم نہ ملتے کوئی اور مل جاتا اور اب بھی تم انکار کرو گے تو بات یہیں ختم ہو جائے گی۔ میں تمھاری مدد کا معاوضہ ادا کرنے کا پہلے ہی وعدہ کر چکی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اپنے مالی مسائل کے حل اور خوشحال مستقبل کی بنیاد کے لیے کتنا چاہیے؟"

"یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔" نادم نے تامّل کر کہا۔ "اعداد و شمار میں اس کا جواب کیسے دوں؟ پہلی بات تو یہ کہ مسائل کے بارے میں ماہرِ معاشیات مرزا غالب نے دریا کو کوزے میں بند فرما دیا ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ پھر یہ کہ خوشحال مستقبل کیا ہوتا ہے۔ نچلی سطح سے دیکھوں تو ایک کوٹھی، کار بنگلا۔ اوپر والوں کے لیے خوشحالی کے معنی بالکل مختلف ہوں گے۔"

"پھر بھی کچھ تو سوچا ہو گا تم نے کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ ذہانت، صلاحیت اور سرمائے کے ساتھ ایک کے دو اور دو کے چار بنا کے عیاشی سے زندگی کیسے بسر کر سکتے ہو۔ فرض کرو ایک لاکھ ہوں تمھارے پاس تو کیا تم اپنی موجودہ بے مقصد، بے ٹھکانہ اور بے روش زندگی کے چکّر سے نکل کر آرام و آسائش اور عزت کی زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی کر سکتے ہو؟" زبیدہ نے کہا۔

"ایک لاکھ۔" نادم نے سوچ کر کہا۔ "ہاں، یہ میں نے اکثر سوچا ہے کہ میرے نام ایک لاکھ کے پرائز بانڈ کا انعام نکل آئے تو شاید میری محتاجی ختم ہو جائے۔ میں دنیا کا محتاج ہوں اور دنیا اب مجھے بار سمجھنے لگی ہے۔"

"اچھا — تو میں بات دو لاکھ سے شروع کرتی ہوں۔" زبیدہ نے کہا۔ "میں یہ پھر بتا دوں کہ اتنی رقم کے بدلے بہت سے لوگ قتل تک کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ میں نے کسی خاص وجہ سے تمھارا انتخاب نہیں کیا ہے۔ نہ میری تم پر پہلے سے نظر تھی اور نہ تم مجھے اچھے لگے تھے۔ اب اچھے لگ رہے ہو مگر اس کا مطلب یہ نہ لینا کہ میں تم پر مرمٹی ہوں۔"

"کیا تم مجھ سے کسی کو قتل کروانا چاہتی ہو؟" نادم نے حیرانی سے اس عورت کو دیکھا جس نے اس کو واقعی متاثر کیا تھا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا۔ کوئی نہ کوئی بات اس میں ایسی تھی کہ دل کو کھینچتی تھی۔

"ہاں۔ میں اپنے شوہر کو قتل کروانا چاہتی ہوں۔ تم ان کو جانتے ہو؟" زبیدہ نے سکون سے کہا۔

نادم بھونچکّا رہ گیا۔ "کیوں؟ اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے؟ اور پھر کسی آشنا کے ساتھ۔ . ."

"نہیں۔ اس کے پاس صرف نام تھا، اب وہ بھی گنوا دیا ہے اس نے۔" زبیدہ بولی۔ "ایک بدکردار عورت کی خاطر۔ میں نے اپنی مرضی سے اس کو شوہر تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ فیصلہ میرے دولت مند باپ کا تھا۔ میں ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی اور

بدصورت بھی تھی۔ چنانچہ ایڈووکیٹ زاہد اسحاق نے مجھے شرفِ زوجیت بخشا اور میرے سادہ لوح باپ نے خدا اسے معاف کرے، میرے شوہر کی اداکاری سے متاثر ہو کے مجھے اُس دولت کے اس جہنم میں دھکیل دیا جو گیارہ برس سے میرا گھر ہے۔ میں امریکا میں بھی ماہر ترین ڈاکٹروں اور نفسیات دانوں کے زیرِ علاج رہی اور جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، اب میں پاگل نہیں ہوں۔"

"میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم پہلے بدصورت کیسے تھیں۔" نادم بولا۔ "کیونکہ آج تم خوبصورت ہو۔ کیا یہ بھی کسی کے اعجازِ مسیحائی کا ہنر ہے؟ کسی نے پلاسٹک سرجری کا کمال دکھایا ہے؟"

زبیدہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "علاج صرف میرے دماغ کا ہوا تھا۔ صورت تو وہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ تم کو یہ حسن میری دولت کے رُوپ میں تو نظر نہیں آرہا ہے؟"

"معاف کرنا" میں موقع بے موقع سچ بول جاتا ہوں۔ آگے کہو۔" نادم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"دولت میرے شوہر کے قبضے میں آگئی تو اس نے مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہا۔" زبیدہ نے کہا۔ "لیکن میں اس سے بلا کی طرح چمٹ گئی۔ اسے چھوڑ دیتی تو میں کہاں جاتی نادم۔ وہی میرا سہارا تھا اور وہی ایک گھر تھا جس کی چھت کے نیچے میرے لیے تحفظ تھا مگر قسمت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ سب دولت میری ہونے کے باوجود میری نہیں تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ مجھے قتل تو کر سکتا ہے لیکن مجھ سے طلاق حاصل نہیں کر سکتا۔ اس نے عدالت میں ایک مقدمہ بھی دائر کیا تھا مگر فیصلہ میرے حق میں ہو گیا۔ اب اس نے حالات سے مفاہمت کر لی ہے اور مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔"

"کوئی شکایت نہیں؟" نادم دم بخود رہ گیا۔ "اور پھر بھی تم چاہتی ہو کہ اسے قتل کر دیا جائے؟"

"پہلے پوری بات سن لو۔" زبیدہ نے کہا۔ "اس نے میری دولت کو بے دریغ اُڑایا۔ عیاشی پر لٹایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کی پریکٹس ختم ہو گئی۔ اس کی لیگل فرم ختم ہو گئی۔ اس نے ماتحت وکیلوں کو اور بیشتر عملے کو رخصت کر دیا اور ان سب کے واجبات ادا کرنے کے لیے اپنا مکان فروخت کر دیا جو گلبرگ میں تھا۔ میں تم کو اس کا نمبر بتا دوں گی۔ لیگل فرم کے بارے میں تم انکوائری کر سکتے ہو۔ اب جو مکان ہمارے پاس ہے، وہ پہلے ہی بینک لون میں رہن رکھا جا چکا ہے۔ میرے زیورات جن کی مالیت ایک لاکھ کے قریب تھی، اب بھی میرے پاس ہیں لیکن ان سے سب قرضے ادا نہیں ہوتے۔ میرا شوہر ڈاکا تو ڈال نہیں سکتا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا ہے۔ یہ دو لاکھ کی پالیسی ہے۔"

"اور وہ چاہتا ہے کہ قتل ہو جائے تاکہ تم کو چار لاکھ ملیں؟" نادم طنز سے ہنسا۔ "یا تم نے یہ طے کیا ہے کہ ایک تیر سے دو شکار کر لو۔"

"تم پھر بیچ میں بولے۔" زبیدہ نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "میرے شوہر کو تقریباً چار ماہ قبل یہ معلوم ہوا کہ وہ جگر کے مہلک سرطان میں مبتلا ہے اور زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ علامات تو پہلے ہی ظاہر ہو جاتی ہیں مگر ان سے کوئی بھی ڈاکٹر فوراً سرطان کی تشخیص نہیں کر سکتا۔ اس کے بہت مخصوص، تکلیف دہ اور پیچیدہ ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ خیر جیسے ہی میرے شوہر کو متعدد ماہرین کا فیصلہ معلوم ہوا جو سب یک رائے تھے، اس نے فوراً دو لاکھ کی لائف انشورنس پالیسی خرید لی۔ ڈبل انڈیمنٹی کے ساتھ۔ وہ جانتا ہے کہ اب اس کی زندگی دو یا زیادہ سے زیادہ تین مہینے رہ گئی ہے اور اصل جسمانی عذاب کا دور اب شروع ہو گا جس میں موت انتہائی کرب کے ساتھ تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر جان دینے کے بعد آئے گی۔"

"چنانچہ وہ چاہتا ہے یا تم چاہتی ہو کہ اس کی نزع کی یہ تکلیف مختصر کر دی جائے؟"

"یہ ایک وجہ ہے۔" زبیدہ نے کہا۔ "وہ چاہتا ہے کہ اتنی تکلیف اٹھائے بغیر مر جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بیماری سے مرنے کے بعد اس کو... میرا مطلب ہے مجھے بیمے کی رقم کا ایک پیسا نہیں ملے گا۔ انشورنس کمپنی کو معلوم ہو جائے گا کہ بیمہ پالیسی لیتے وقت اس نے میڈیکل رپورٹ میں ہیرا پھیری کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہے اور اسے کتنے دن جینا ہے۔ چنانچہ اس نے موت کو چار لاکھ کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ اپنے بارے میں غلط بیانی کی اور بیماری کو چھپا لیا یا کمپنی کے ڈاکٹر کو رشوت دے کر خاموش کر دیا کہ اس بیماری کا ذکر نہ کریں۔ ڈاکٹر کون تھا؟ یہ مجھے معلوم نہیں مگر موت کے اصل حقائق سامنے آنے کے بعد وہ بھی چکر میں آجائے گا لیکن کوئی میرے شوہر کو قتل کر دے تو یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کے اسباب تفصیل سے بتائے جائیں گے مگر یہ اسباب ظاہری ہوں گے۔ ساری تفتیش مہلک زخموں تک محدود رہے گی اور سرطان کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ کسی نے گردن کاٹ دی ہو، خنجر دل میں اُتار دیا ہو یا گولی سے دماغ پاش پاش کر دیا ہو تو جگر کے عارضے کو موت کا سبب کون سمجھ سکتا ہے؟"

نادم کو خوف اور حیرت کی انتہا نے مفلوج کر دیا تھا۔

وہ کھانا بھول کر ٹکٹکی باندھے زبیدہ کو دیکھ رہا تھا جو ایک انتہائی پُرفریب قاتلانہ منصوبے کی تفصیلات اتنے سکون کے ساتھ بیان کر رہی تھی جیسے گزشتہ رات ٹی وی پر دکھائی جانے والی کسی کرائم اسٹوری کا پلاٹ سُنا رہی ہو۔ وہ کمزور اعصاب کا آدمی نہیں تھا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت شدید ترین صدمات سے بھی متاثر نہیں ہوتی تھی مگر زبیدہ کی بات نے اُسے چکرا دیا۔

"دو لاکھ مجھے دے کر... تم یہ کام مجھ سے لینا چاہتی ہو؟" اس نے بمشکل تمام کہا۔ "کیا میں کوئی پیشہ ور قاتل ہوں؟ میں نے تو صرف ایک بار چوری چھپے ایک قاتل کو پھانسی چڑھتے دیکھا تھا اور پھر ایک مہینے تک سو نہیں سکا تھا۔ اب بھی اس منظر کے تصوّر سے میرا خون سرد پڑنے لگتا ہے...."

"تم تو بہت بُزدل آدمی ہو۔" زبیدہ مسکرائی۔ "اتنی جلدی تمھاری عقل خبط ہوگئی۔ بھلا میں دو لاکھ دے کر تم سے یا کسی سے بھی یہ توقع رکھ سکتی ہوں کہ وہ پھانسی چڑھ جائے؟ دو لاکھ کیا دو کروڑ میں بھی کوئی قتل کرکے پھانسی قبول نہیں کرسکتا۔ حوصلے سے کام لو اور کھانا جاری رکھو۔ تم کو بالکل پھانسی نہیں ہوگی۔ ایک فیصد بھی نہیں۔ ایک دن کی پھانسی بھی نہیں۔"

"ہر مجرم سمجھتا تو یہی ہے۔" نادم بولا۔ "مگر کوئی جرم سو فیصد مکمل نہیں ہوتا۔"

"میں تم سے اتفاق کرتی ہوں۔" زبیدہ نے کہا۔ "لیکن یہ جُرم نہیں ہے۔ قدرت ایک شخص کو سزائے موت دے چکی ہے اور اب وہ سکون سے مرنا چاہتا ہے۔ وہ خودکشی بھی کرسکتا ہے مگر قتل ہونے کی صورت میں اس کو دُہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو موت اپنی مرضی کے مطابق ملتی ہے۔ اس کے علاوہ موت کی دُگنی قیمت ملتی ہے جو خودکشی کی صورت میں بالکل نہیں ملتی۔ اس رقم سے وہ اپنا مقبرہ بنوانا نہیں چاہتا اور کوئی ٹرسٹ قائم کرکے صدقۂ جاریہ کا ثواب حاصل کرنے کا خواہش مند نہیں۔ وہ تو اپنے دنیاوی قرض ادا کرنا چاہتا ہے اور اپنی بیوی کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ صرف قرض چھوڑ کر مرے گا تو بیوی بے گھر ہوجائے گی۔ میں تمام عمر عیش کی زندگی گزارتی آئی ہوں نادم۔ میں کہیں کلرک، آپریٹر یا کال گرل وغیرہ بھی نہیں ہوسکتی۔ میرے گھر میں دو ملازم ہیں۔ کیا میں یہ تصوّر کرسکتی ہوں کہ میں خود کسی کے گھر کی ملازم ہوجاؤں۔ وہاں بچّے کھلاؤں اور برتن مانجھوں؟"

"خدا کے لیے بس کرو۔ تمھاری مجبوریاں اور کمزوریاں اپنی جگہ۔" نادم نے کہا۔ "لیکن ذرا سوچو تم مجھ سے کیا کہہ رہی ہو؟ اگر میں سیدھا پولیس کے پاس چلا جاؤں اور یہ سب بتا دوں تو...."

"تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" زبیدہ نے کہا۔ "میں صاف انکار کردوں گی کہ میں نے تم سے ایسی کوئی بات کی تھی۔ تم دو لاکھ کے انعام سے محروم ہوجاؤ گے اور اسی طرح خیرات مانگ کے جینے کا حق حاصل کرتے رہو گے اور یہی زندگی گزارتے رہو گے جو آوارہ کتّے کی زندگی سے بدتر ہے۔ فقیر کی زندگی تو شاہانہ ہوتی ہے۔ تم دنیا کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے ذلیل ہوکے مرو گے تب بھی تم کو سچ کا نوبل پرائز کوئی نہیں دے گا۔"

"اور تم... تم کیا کروگی؟ اگر تمھیں بیمے کی رقم نہ ملی؟" نادم نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"خودکشی۔ غربت اور مفلسی کی زندگی کے لیے میری قوتِ برداشت صفر ہے۔" زبیدہ نے کہا۔ "اور مجھ میں در بہ در پھرنے کی ہمّت بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی کسے خیال ہوگا میرا۔"

"تمھارے تو پرستار بھی کم نہ ہوں گے اور کام کرنے والوں کی کیا کمی۔" نادم نے کہا۔

"تم کیا بننا پسند کروگے؟" زبیدہ نے کہا۔ "پرستار یا صرف معاوضے پر کام کرنے والے؟ تم کو شاید معلوم نہیں کہ اس شہر میں سب کچھ بکتا ہے۔ اس سے نصف رقم پر میں ایک پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کرسکتی تھی مگر میں نے تم کو موقع دیا ہے کہ تم چاہو تو کسی احساسِ جرم و گناہ کے بغیر دو لاکھ سے ایک نئی پُرمسرّت اور کامیاب زندگی کا آغاز کرسکو۔ تم اس موقعے کو ٹھکرا کے ساری عمر پچھتاؤ گے۔"

"مجھے... مجھے سوچنے دو۔ میں اس عمر میں پھانسی کے تختے پر بھی نہیں جانا چاہتا بیگم صاحبہ۔"

"پھر وہی احمقانہ بات۔ ارے بھئی جب قتل کا دعوےٰ کرنے والا کوئی نہیں ہوگا تو ڈر کیسا؟" زبیدہ نے کہا۔ "قتل کیسے کرنا ہے، یہ تم کو خود میرا شوہر سمجھا دے گا۔ تم اس پر غور کرلینا۔ اس کا اور تمھارا دور کا تعلق بھی ثابت نہیں ہوتا۔ شبہ کوئی کر سکتا ہے تو مجھ پر کہ میں نے بیمے کی رقم کی خاطر قتل کیا اور لوگ تو یہ بھی جانتے ہیں کہ میرے تعلقات میرے شوہر سے کتنے کشیدہ رہے ہیں۔ تمھارے متعلق کسی کو کیا معلوم کہ تم مجھ سے ملے ہو۔"

"کیوں۔ تم اتنے مشہور وکیل کی بیوی ہو۔" نادم بولا۔ "اور تم نے تھانے آکر اور پھر عدالت میں...."

"میں تو صرف تھانے گئی تھی۔" زبیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہاں تو شاید لوگ زاہد اسحاق کو بھی نہ پہچانتے۔ عدالت میں صرف تم گئے تھے اور تم نے نقد پانچ ہزار جمع کرادیے تھے۔ وہاں وکیل ہوتے ہیں لیکن مجھے کوئی بھی نہیں پہچانتا۔ اس لیے کہ میں اسحاق کے ساتھ پبلک لائف میں ساتھ نہیں رہتی۔ کیا

تم یقین کرو گے کہ ہم کبھی ایک ساتھ باہر نہیں نکلتے۔"

"میں نے تم سے سچ بولنے کو کہا تھا اور تم نے بہت سے جھوٹ بولے ہیں۔" نادم نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "تم کہتی ہو کہ تمہارے پاس اب قرض کے سوا کچھ نہیں لیکن تم نے پانچ ہزار مجھے غیر مشروط طور پر بخش دیے۔ پھر کم سے کم ایک ہزار تم نے میرے لباس کے ادا کیے اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز سے تمہارا کریڈٹ چلتا ہے۔ وہ معمولی امیروں کو بھی کریڈٹ نہیں دیتے۔ کھانے کے لیے تم یہاں آئی ہو، جہاں میں نے آج تک قدم نہیں رکھا۔ دو لاکھ کی پیشکش تم مجھے کر چکی ہو۔ یہ رقم کہاں سے ادا کرو گی۔ بیمے کی رقم تو بعد میں ملے گی۔"

"ایک لاکھ کے تو زیورات ہیں میرے پاس۔" زبیدہ نے کہا۔ "یہ تمہارا ایڈوانس ہوگا۔ باقی رہے یہ رئیسانہ انداز تو میں ان کی عادی ہوں۔ آج سے نہیں، میری ساری زندگی ایسی ہی گزری ہے لیکن اب یہ ظاہری شان و شوکت ہے۔ اندر سے یہ عمارت کھنڈر ہے جو باہر سے قصر نظر آتی ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا، وہ اس بدکردار عورت نے میرے شوہر کو بلیک میل کر کے اس سے چھین لیا ہے۔ مجھے اس عورت کا نام تک معلوم نہیں مگر اسحاق نے مجھے یہی بتایا ہے۔"

"اور تمہارا نامور وکیل شوہر اتنا بے وقوف ہے کہ ایک بلیک میلر سے نہیں نمٹ سکتا؟"

"پولیس بلیک میلر کو بند کر سکتی ہے، اس کی زبان کو نہیں۔" زبیدہ نے کہا۔ "اور میرا عزت دار شوہر مرنے سے پہلے رسوا نہیں ہونا چاہتا۔ کمزوری اس کی اپنی ہے، اس لیے وہ مجبور بھی ہے۔ ایک بلیک میلر بند ہوگا تو دوسرا آجائے گا۔ اس کے پاس اب انھیں دینے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ چنانچہ ان حالات میں اس کا یہ فیصلہ بالکل جائز، منطقی اور برمحل ہے کہ اسے اب اپنی جان دے دینی چاہیے۔ یہی اس کے اور میرے سارے مسائل کا حل ہے اور اس بلیک میلر کی شکست ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں زبیدہ نے کھانے کا بل ادا کیا اور نظریں جھکائے اپنے ناخن کترتی رہی کیونکہ نادم کی نظریں اس کی صورت پر جم گئی تھیں اور زبیدہ اس سے نظر ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ان آنکھوں میں ان گنت سوال تھے۔ وہ تمام سوالوں کے جواب دے سکتی تھی مگر ایک سوال سب سے الگ تھا جو زبیدہ کو سراب کی طرح لگتا تھا۔ زبیدہ نے اس سے پوچھا تھا کہ تم کیا بنو گے؟ میرے پرستار کہ کارندہ اور اب نادم کی آنکھیں اس سے پوچھتی تھیں کہ اگر میں کارندہ نہ بنوں تو کیا مجھے پرستار کی حیثیت سے قبول کر لو گی؟ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ میرا دل مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ کوئی مجھے ان حالات میں پرستش کا نذرانہ کیسے دے سکتا ہے۔

"کیا میں تمہارے اس نیک دل شوہر سے مل سکتا ہوں؟" نادم نے کہا۔ "جو مرحوم ہو چکا ہے۔"

"ہاں۔ کل شام کو تم اسی جگہ آ سکتے ہو؟" زبیدہ نے کہا اور مسکرائی۔ پھر وہ نادم کو رخصت ہوتا دیکھتی رہی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ نادم ضرور آئے گا۔ دو لاکھ کی خاطر نہیں، اس کی خاطر۔ یہ اگر اس کے دل کا دھوکا تھا تو بڑا خوبصورت دھوکا تھا۔ معلوم نہیں تقدیر اب اس کے ساتھ کون سا نیا کھیل کھیلنے میں مصروف تھی۔

گیارہ سال بعد اسحاق نے بھی اپنے دل کے دروازے اس پر کھول دیے تھے اور اسے وہ جگہ دے دی تھی جو اس کا حق تھی۔ کیا وہ بھی ایک خوبصورت دھوکا تھا۔ کاش میں یہ فیصلہ کر سکتی! اس نے اٹھتے ہوئے سوچا۔ نیلم نے بھی اسحاق کو بڑا خوبصورت دھوکا دیا تھا۔ اب اسحاق دنیا کو ایک خوبصورت دھوکا دے رہا تھا۔ خود زبیدہ بھی نادم کو ایک خوبصورت دھوکا دے رہی تھی اور اسے یہ خوبصورت دھوکا ہو رہا تھا کہ نادم اس کا کارندہ نہیں، پرستار بننا چاہتا ہے۔ زندگی کتنا خوبصورت دھوکا بنتی جا رہی ہے!

اس کی مرسیڈیز ہوٹل کے باہر صف بستہ سیکڑوں گاڑیوں کے ساتھ اس کے انتظار میں چشم براہ تھی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور وہ مال سے گھوم کر ٹالنٹن مارکیٹ کے قریب آگئی۔ کار کو پھر دور چھوڑ کر وہ سڑک کے پار جیولرز کی دکانوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ آخری بار وہ کسی جیولر کی دکان میں کب گئی تھی؟ شاید چار سال پہلے مگر اب تک ہمیشہ وہ خریدار بن کے پورے غرور اور اعتماد کے ساتھ گئی تھی۔ آج اس کا وہ اعتماد ایک احساس ندامت میں ڈھل گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا کی نگاہیں اس پر ہیں کیونکہ آج وہ مجبوری کی حالت میں اپنا زیور بیچنے آئی ہے۔ اس میں کسی دکان کے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ تھی اور اسی لیے وہ چلتی جا رہی تھی۔ بنک اسکوائر تک پہنچ کے وہ واپس ہوئی۔ میں کوئی جرم تو نہیں کر رہی ہوں۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ زیور میرا اپنا ہے اور ضرورت کے وقت بہت سے لوگ زیور ہی بیچتے ہیں یا گروی رکھتے ہیں۔ جیولرز کے بارے میں تو اس نے سنا تھا کہ وہ چوری کا مال تک خریدتے ہیں۔ وہ اپنا حوالہ دے سکتی ہے کہ بیرسٹر زاہد اسحاق اس کے شوہر ہیں۔ وہ ایک دکان میں داخل ہو گئی۔

دکان دار نے کاروباری اخلاق اور شائستگی کے ساتھ مسکرا

کے اس کا خیر مقدم کیا۔

"وہ۔۔۔ دیکھیے۔ میں کچھ خریدنے نہیں آئی ہوں۔" زبیدہ نے کہا اور اسے اپنا گلا خشک محسوس ہوا۔ "کچھ زیور ہے میرے پاس۔۔۔ اور۔۔۔ میں۔۔۔ میں اسے بیچنا چاہتی ہوں۔۔۔ میں بیرسٹر زاہد اسحاق کی بیوی ہوں۔" زبیدہ نے لکنت کے ساتھ کہا۔

"لائیے۔ ہم آپ کو سب سے بہتر قیمت پیش کریں گے۔"

دکان دار کی شائستگی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ زبیدہ نے قدرے مطمئن ہو کے ہینڈ بیگ سے وہ زیور نکالا جو شادی کے بعد سے اب تک گھر میں ہی بند پڑا رہا تھا۔

دکان دار نے ایک ایک کر کے سب چیزوں کو اوپر لگے ہوئے تیز بلبوں کی روشنی میں دیکھا۔ اس کی صورت کا تاثر کئی بار بدلا اور درمیان میں اس نے زبیدہ کو یوں دیکھا کہ زبیدہ کو پسینہ آگیا۔ شاید خریداروں کے مقابلے میں مجبوری کے تحت کچھ بیچنے والوں کے ساتھ یہ سیٹھ ساہوکار ایسی ہی شرافت آمیز مگر پُر تحقیر محسوس ہونے والی تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوں گے۔

"مسز اسحاق!" دکان دار نے زیور سمیٹ کر کہا۔ "آپ کو کسی نے غلط بتایا۔ انارکلی بازار کے اندر دو تین دکاندار ہیں جو نقلی زیورات خریدتے ہیں۔ ہم 'امیٹیشن جیولری' میں ڈیل نہیں کرتے۔"

"امیٹیشن!" زبیدہ کو یوں محسوس ہوا جیسے یکلخت دکان کی ساری چکاچوند ختم ہوگئی ہے اور وہ گھُپ اندھیرے میں گر رہی ہے۔ "یہ امیٹیشن جیولری ہے؟" وہ چلّائی۔

"دیکھیے۔۔۔ دیکھیے ذرا خود کو سنبھالیے۔۔۔ ایسا ہوتا ہے۔" معاملہ فہم دکان دار نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ کے کہا۔ "اگر کسی نے آپ سے کہا تھا۔۔۔ یا آپ کو اب تک یقین تھا کہ یہ اصلی جیولری ہے تو مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔ لیجیے۔۔۔ یہ پانی پی لیجیے۔۔ مسز اسحاق۔" اس کے آخری الفاظ میں طنز سے زیادہ تمسخر تھا۔

گھر پہنچنے کے بعد زبیدہ کو بہت تعجب ہوا کہ اتنے بڑے صدمے کے باوجود ذہنی طور پر وہ مستعد رہی اور اس سے کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا۔ وہ پُرہجوم اور بارونق سڑکوں پر سے گزر کے کسی سے ٹکرائے بغیر نکل آئی تھی اور ذہن کا یہ خودکار حفاظتی کارنامہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ ورنہ وہ خود ذہنی و جسمانی طور پر اس قابل کہاں تھی کہ خود کو بھی سنبھال سکتی۔ اسحاق اسے لان میں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے پاس پہنچی اور ایک کرسی پر گر گئی۔ بیگ کے سارے زیورات کو اس نے لان پر الٹ دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔ ایسے پھینک رہی ہو ان کو یہاں؟" اسحاق نے کہا۔

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ راستے میں رک کر کسی گڑھ میں پھینک سکتی۔" اس نے ہسٹریا کے سے طوفان میں ایک تنکے کی طرح زیر و زبر ہوتے ہوئے کہا۔ "جاؤ یہ بھی اسی فاحشہ کو پہنا آؤ جسے اصل زیورات کا تحفہ دے چکے ہو۔ وہی تو تھی تمھاری سب کچھ، میں کیا تھی؟ میرا سہاگ تک تو تم نے اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔"

"زبیدہ! مجھے معاف کر دو۔" اسحاق نے سر جھکا کے کہا۔ "میں سب کی تلافی کر دوں گا۔"

"تلافی!" زبیدہ چلائی۔ "کس کس کی تلافی کرو گے تم؟ اتنے خوبصورت دھوکے دیے ہیں تم نے مجھے۔ فراڈ سے چار لاکھ حاصل کر کے مجھے ایک لاکھ کی جیولری تو لے دو گے مگر میرے دل کے ہر زخم کا درماں کہاں سے لاؤ گے؟ گیارہ سال میں جو دکھ میں نے اٹھائے، جو کچھ میرا تھا مگر مجھے نہ ملا، جتنے ڈاکے تم نے میرے اعتماد پر ڈالے، ان سب کی تلافی کیسے کرو گے تم؟ وقت تو گزر چکا ہے اسحاق!" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگی۔ "کیسے تلافی ہوگی اب؟"

"تم دیکھ لوگی ـــ" اسحاق نے دونوں ہاتھ ہٹا کے اس کے آنسو پونچھے۔ "گزرے ہوئے کل کو بھول جاؤ۔ اب میں صرف تمھارا ہوں۔ تمھاری محبت نے بالآخر مجھے جیت لیا ہے۔ میں تم سے محبت کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں زبیدہ۔"

"کاش میں تم سے نفرت کر سکتی۔ کاش یہ میرے اختیار کی بات ہوتی۔" وہ روتے روتے بولی۔

"مجھے میری بیوی نے صرف آپ کا نام بتایا ہے۔" اسحاق نے ریسٹورنٹ کے آخری تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے نادم سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "اور یہ کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"یہ فیصلہ میں نے ابھی نہیں کیا مسٹر اسحاق!" نادم نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر کہا۔

"کیوں؟ کیا ابھی تک کوئی بات تصدیق طلب ہے؟" زبیدہ مسکرائی اور نیم روشن کمرے میں اس کے موتی جیسے دانت جھلملائے۔ نادم کا ہاتھ پل بھر کے لیے رکا۔ زرد لباس میں آج اس کا حسن شفق کی روشنی سے طلوع ہونے والے آفتاب کی طرح نئی تازگی لیے ہوئے تھا۔ اس نے غور کیا کہ یہ نیا پن صرف لباس یا رنگ کا کرشمہ نہیں، زبیدہ نے اپنے بال بھی نئے انداز سے سیٹ کرائے تھے۔ اس کے کندھوں تک پہنچنے والے ریشمی بالوں کا پھسلتا ہوا سنہرا ڈھیر اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رہا تھا جسے وہ ایک ادائے ناز سے سر جھٹک کر پیچھے کرتی تھی تو اس کی صراحی دار گردن کی رنگت بھی سنہری لگتی تھی۔ کل تک اس کے بال کالے تھے

اور تراشیدہ نہ تھے۔ یہ سنہرا پن یقیناً ہیئر کلر کا رنگ تھا یا ہائیڈروجن پر آکسائڈ کا کارنامہ۔ اس سے بڑا کمال اس ماہرِ فن نے دکھایا تھا جس نے ان زلفوں کو یہ انداز عطا کیا تھا۔ زرد لباس کے ساتھ بالوں کا سنہرا اُجالا بڑا چکا چوند پیدا کرنے والا تاثر چھوڑتا تھا۔ صرف چوبیس گھنٹے میں کسی بیوٹی پارلر نے اس کے حسن کی شرابِ ناب کو مئے دو آتشہ کر دیا تھا۔ حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا۔ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا۔ نادم نے نظر زبیدہ پر سے ہٹا کے سوچا۔

”کل سے اب تک میں نے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے“ نادم نے اسحاق کو مخاطب کر کے کہا ”مثلاً یہ کہ آپ کی بیوی نے آپ کے مالی حالات کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا‘ درست تھا۔ آپ نے بیگل فرم ختم کر دی ہے اور ایک مکان بھی بیچا ہے۔ یہ کل ایک جیولر کی دکان پر اپنا زیور فروخت کرنے بھی گئی تھیں “

زبیدہ کا رنگ جو نادم کی نظر نے گلابی کر دیا تھا‘ یکلخت زرد ہو گیا۔ اس نے بڑے دکھ سے اسحاق کو دیکھا۔

”میں دکان دار سے کچھ پوچھنے نہیں گیا تھا“ نادم نے کہا۔ ”میں نے باہر سے ہی آپ کو زیورات اس کے سامنے رکھتے ہوئے دیکھا تھا اور سیدھا نکل گیا تھا“ اس نے دیکھا کہ ایک پُراطمینان مسکراہٹ آہستہ آہستہ زبیدہ کے لبوں پر یوں اُتر آئی ہے جیسے تاریک کمرے میں دروازے کے کسی سوراخ سے دھوپ کی ایک کرن کی لکیر اندر اُترتی ہے مگر جو بات نادم کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی‘ وہ اسحاق کی ظاہری حالت تھی۔ وہ ذرا بھی بیمار نظر نہیں آتا تھا۔ ایک نظر دیکھنے والا یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اتنا خوش پوش اور خوش باش آدمی دنیا میں صرف دو ماہ کا مہمان ہے۔

”میں اب صرف اس بات کا ثبوت چاہتا ہوں اسحاق صاحب کہ آپ واقعی . . . بیمار ہیں“ نادم نے کہا۔

”ثبوت میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ مجھے معلوم تھا تم ایسے یقین نہیں کرو گے۔ کرنا بھی نہیں چاہیے“ اسحاق نے بریف کیس کھول کے کچھ کاغذات نکالے اور نادم کی طرف بڑھا دیے ”یہ سب میڈیکل رپورٹس ہیں“

نادم نے ایک ایک کر کے تمام کاغذات پر نظر ڈالی۔ وہ ڈاکٹروں کی زبان میں لکھی ہوئی بات ہی سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے چار مشہور اور مستند لیبارٹریوں کی ہر رپورٹ کو نظر انداز کر دیا جن میں اعداد و شمار یا چارٹ اور گراف تھے۔ ہر ڈاکٹر نے اپنے لیٹر ہیڈ پر الفاظ کے ردّوبدل کے ساتھ ایک ہی بات لکھی تھی کہ مسٹر اسحاق کے ٹرمنل کینسر کی آخری اسٹیج ہے اور ان کے لیے چھ ماہ تک زندہ رہنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

”اسحاق صاحب! یہ سب رپورٹیں جن میں ڈاکٹروں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے آپ کے نام نہیں ہیں“ نادم نے کہا۔ ”بلکہ رپورٹیں دیکھنے کے بعد ہر ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر کو اپنے ٹسٹ کے نتائج سے مطلع کیا ہے۔ یہ سب کاغذات تو ڈاکٹر اپنی کیس فائل میں رکھتے ہیں “

”میں نے اپنے وسائل سے ہر فائل کے ضروری کاغذات نکلوا لیے۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی “ اسحاق نے کہا۔

”بجا ارشاد۔ لیکن ذرا غور فرمائیے کہ کتنے لوگ آپ کی بیماری کے راز سے واقف ہیں“ نادم نے کہا۔ ”چار ڈاکٹر‘ ان کے اسسٹنٹ‘ لیبارٹری ایکسپرٹ‘ ایکسرے لینے والے اور ریڈیولوجسٹ‘ رپورٹس ٹائپ کرنے اور بھجوانے والے۔ کیا یہ سب لوگ انشورنس کمپنی کو کچھ نہیں بتائیں گے ؟“

”انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ میں نے ڈبل انڈمنیٹی کے ساتھ دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے“ اسحاق نے کہا ”اور جب زبیدہ کلیم فائل کرے گی تو یہ خبر اخبار میں نہیں آئے گی کہ انھیں معلوم ہو۔ قتل کے کیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ادائیگی ہو جائے گی۔ اس میں موت کا سبب کیا ہوگا‘ یہ آپ جانتے ہیں۔ اگر میں خودکشی کرتا ہوں تو یہ میرا اختیاری فعل ہے۔ زندگی کے تین مہینے اس قیمت پر کوئی بھی بیچ سکتا ہے مگر قتل کی واردات بالکل مختلف چیز ہے۔ بیشتر لوگوں کو اس بیوہ سے ہمدردی ہوگی جس کے شوہر کو ہر حال مر جانا تھا “

”بہت خوب! اب ذرا اپنے منصوبے کی وضاحت بھی فرما دیجیے“ نادم نے کہا ”میرا خیال ہے نوّے فیصد صورتوں میں قتل کا سراغ مل جاتا ہے۔ پولیس کوئی نہ کوئی تعلق تلاش کر لیتی ہے۔ میں پھانسی پا کے مرنے سے بہت ڈرتا ہوں“

اسحاق ہنسا۔ ”اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ پچاس فیصد قتل ہمیشہ ایک رازِ سربستہ رہتے ہیں۔ تاہم میں بتاتا ہوں کہ آپ کی پوزیشن کس طرح محفوظ ہے۔ میں نے ایک پراپرٹی ایجنٹ کی معرفت کراچی میں سمندر کے ساحل پر ایک کاٹج حاصل کیا ہے۔ اس میں ایک کرائے کی کار بھی ہوگی اور ایک موٹر بوٹ بھی۔ میں نے اپنے سب جاننے والوں کو بتا دیا ہے کہ ہم میاں بیوی ایک ماہ کے لیے وہاں اپنا دوسرا ہنی مون منانے جا رہے ہیں “

”کیا خوبصورت دھوکا ہے“ زبیدہ ہنسی ”ہم نے تو اپنا پہلا ہنی مون بھی نہیں منایا تھا “

”اس کی ایک وجہ تھی“ اسحاق نے تند لہجے میں کہا ”جب ہماری شادی ہوئی تھی تو زبیدہ نارمل نہیں تھی۔ یہ کئی سال تک

یورپ اور امریکا کے نفسیاتی اسپتالوں میں زیرِ علاج رہی ۔"

"صاف پاگل خانہ کیوں نہیں کہتے ۔" زبیدہ نے کہا۔ "خوبصورت نام بھی تو خوبصورت دھوکا ہوتے ہیں ۔"

"چلو یہی سہی لیکن اب زبیدہ بالکل ٹھیک ہے اور میں نے سب سے کہا ہے کہ ہماری ازدواجی زندگی حقیقی معنوں میں اب شروع ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان جو... غلط فہمی... یا کشیدگی تھی، وہ اب نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ایک نئی زندگی کے خوشگوار آغاز کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہی زبیدہ نے بھی کہا ہے۔ چنانچہ شک کسی کو نہیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ روانہ ہوں گے۔ ہم ہوائی جہاز سے جائیں گے اور تم ٹرین سے پہنچو گے۔ تم کسی بھی فرضی نام سے سفر کر سکتے ہو۔ اپنے لیے تم ایئرکنڈیشنڈ کوچ میں ایک برتھ ریزرو کرا کے جاؤ گے اور وہاں پہنچ کر صدر میں قیام کرو گے۔ صدر سے کلفٹن اور کلفٹن سے منوڑا کا جزیرہ بہت دور ہے۔ تم ایک چکر لگا لینا وہاں کا تاکہ ساحل کے پورے علاقے کو اچھی طرح دیکھ سکو۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر میں اپنی موٹر لوٹ لے کر سمندر میں نکلوں گا۔ موٹر لوٹ تفریح کے لیے ہی حاصل کی گئی ہے۔ اس سے ایک دن پہلے زبیدہ کار میں نارتھ ناظم آباد جائے گی۔ تم نے کراچی دیکھا ہے؟" اس نے ایک کاغذ پر ہاتھ سے بنایا ہوا نقشہ میز پر پھیلا دیا تھا۔

نادم نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اگرچہ اس کے کان اسحاق کی آواز سن رہے تھے اور اس کا ذہن الفاظ کا مفہوم بھی سمجھ رہا تھا مگر اس کی نگاہیں زبیدہ پر تھیں جو کچھ نروس ہونے لگی تھی۔ وہ دوپٹے کے ایک کونے کو ایک انگلی پر لپیٹتی تھی پھر کھولتی تھی۔ نادم کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتی تھی اور اسے بدستور اپنی جانب متوجہ پا کے گھبرا کے چائے کا کپ اٹھا لیتی تھی یا پھر پہلو بدل کے دوسری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ اسحاق کی نظر نقشے پر تھی۔ چنانچہ اس نے نادم کی محویت اور زبیدہ میں اس کی دلچسپی کو نوٹ نہیں کیا۔

"یہ کلفٹن ہے ۔" اس نے بال پوائنٹ سے بنی ہوئی ایک قوس نما لکیر پر انگلی پھیری۔ "یہ سمندر اور یہ منوڑا ہے۔ لائٹ ہاؤس یہاں ہے۔ اس کے عقب میں چٹانیں ہیں۔" نادم نے اب پورے دھیان کے ساتھ کاغذ کو دیکھا۔ ہر مقام کی نشاندہی ایک دائرے سے کی گئی تھی۔

"اس مقام سے نارتھ ناظم آباد کم سے کم پندرہ میل دور ہے۔" اسحاق نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہاں میرا ایک وکیل دوست رہتا ہے۔ کئی سال پہلے وہ میرا ماتحت تھا۔ اس کی بیوی اتفاق سے زبیدہ کے باپ کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کی بیٹی ہے۔ زبیدہ اس سے ملنے جائے گی اور کچھ ایسا ہوگا کہ رات کو اس کی گاڑی خراب ہو جائے گی۔ نارتھ ناظم آباد میں رات نو دس بجے کے بعد بہت کم رونق ہوتی ہے اور کسی قسم کی سواری نہیں ملتی۔ اس وقت مکینک کے ملنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ زبیدہ رات کو وہیں رُک جائے گی۔ وہ جانے سے پہلے کاٹیج کے مالک کو بتا کے جائے گی جو اسی کاٹیج کے نصف حصّے میں رہتا ہے۔ ایک ریٹائرڈ گورنمنٹ آفیسر اور اس کی تقریباً بہری بیوی۔ جب رات کو وہ واپس نہ آسکے گی تو پھر لینڈ لارڈ کو فون کر کے یہ سب بتا دے گی اور وہ مجھے بتا دے گا۔ اس طرح کاٹیج سے زبیدہ کی عدم موجودگی کے متعدد گواہ ہوں گے اور قتل کا الزام اس پر کسی صورت نہیں آئے گا۔ صبح میں بھی اپنے لینڈ لارڈ کو بتا کے موٹر لوٹ میں نکلوں گا اور اسے کہہ دوں گا کہ میں منوڑا کی سمت جا رہا ہوں اور اگر زبیدہ آ کے پوچھے تو اسے بتا دے۔ زبیدہ گیارہ بارہ بجے دوپہر سے قبل نہیں لوٹ سکے گی۔ وہ گاڑی کسی مکینک کو دکھائے گی جو بتائے گا کہ بی بی تمہارے اگنیشن کوائل کا ایک تار نکل گیا تھا اور بس۔ مگر مکینک دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں ملتے اور وہاں سے راستہ بھی گھنٹا بھر کا ہے۔ کاٹیج پہنچنے پر اسے لینڈ لارڈ میرے متعلق بتائے گا کہ میں کہاں گیا ہوں۔ وہ دوپہر کے کھانے پر انتظار کرے گی۔ پھر تشویش کا اظہار کرے گی اور شام تک پولیس کو میرے واپس نہ آنے کی اطلاع دے دے گی ۔" وہ دم لینے کے لیے رُکا اور اس نے ایک نظر نادم کو اور پھر زبیدہ کو دیکھا۔ نادم کی نظر نقشے پر تھی مگر زبیدہ پلک جھپکائے بغیر نادم کو دیکھ رہی تھی۔

"اسی دن صبح نو بجے تم مجھے اس لائٹ ہاؤس سے ایک فرلانگ دور ملو گے ۔" اسحاق نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہاں سے میں تم کو اپنی موٹر لوٹ میں لے جاؤں گا۔ ریوالور میرے پاس ہے اور اس ریوالور کا کوئی لائسنس بھی نہیں ہے۔ ساحل سے ایک میل دور جا کے میں پانی میں کُود جاؤں گا اور تم اس ریوالور سے میرے چہرے پر چھ فائر کرو گے، مسلسل۔ پھر تم ریوالور کو وہیں سمندر میں پھینک دو گے اور موٹر لوٹ لے کر فرار ہو جاؤ گے۔ موٹر لوٹ کو تم کیماڑی کے ساحل پر کہیں بھی چھوڑ سکتے ہو۔ اتنا خیال رہے کہ تمہارے فنگر پرنٹ بھی کہیں نہ ملیں۔ ویسے تو پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔ فائر کرتے وقت بھی تم دستانے استعمال کر سکتے ہو۔ کیماڑی سے تم بس یا رکشا وغیرہ میں صدر پہنچ جاؤ گے۔ جہاں صدر کے ہوٹل نیشنل سٹی میں تمہارا قیام ہوگا۔ جس نام سے تم ٹرین میں کراچی تک سفر کرو گے" اسی نام سے کمرہ لو گے۔ چنانچہ بعد میں زبیدہ کے لیے تم سے رابطہ قائم کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ منوڑا کے ساحل پر کوسٹ گارڈ یا مچھیرے میری لاش

سمندر سے نکال لیں گے اور زبیدہ مجھے شناخت کرے گی۔ میری تدفین بھی کراچی میں ہوگی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ، ڈیتھ سرٹیفکیٹ، یہ سب معاملے زبیدہ کو وہیں طے کرنے ہوں گے۔ انشورنس کمپنی کا ڈاکٹر یا نمائندہ بھی وہیں ضروری تصدیق کرے گا۔"

"زبیدہ نے مجھے آدھی رقم پہلے ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔" نادم بولا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ بعد میں مجھے پوری رقم مل جائے گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں انتظار کرتا رہ جاؤں اور وہ لاہور لوٹ جائے۔"

اسحاق مسکرایا۔ "تم میں عقل نام کو نہیں۔ ارے بھائی، تم تو زبیدہ کو بلیک میل کر سکتے ہو۔ یہ کہہ سکتے ہو کہ تم میرے سرطان کا راز فاش کر دو گے۔ تم انشورنس کمپنی کے ڈاکٹر کو گمنام فون کر دو گے اور اگر ان کو شک بھی ہو گیا تو وہ میری لاش دوبارہ نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرا لیں گے۔ اس سے سرطان کی موجودگی ثابت ہو جائے گی اور زبیدہ نے ایک لاکھ بچائے تو چار لاکھ گنوائے گی۔ تم تو پھر بھی ایک لاکھ کے فائدے میں رہو گے۔ نقصان ہوگا زبیدہ کا۔ ادائیگی فوراً نہیں ہوتی۔ بہت جلدی کی تب بھی انشورنس کی رقم ایک ماہ سے پہلے نہیں ملے گی۔ زبیدہ تم کو باقی رقم ایک ہفتے میں پہنچا دے گی۔"

"کیسے؟" نادم نے کہا۔ "کہاں سے آئیں گے باقی ایک لاکھ؟"

"تم کو آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے۔" اسحاق بولا۔ "ایک ہفتے بعد تمھیں ادائیگی نہ ہو تو تم انشورنس کمپنی کو فون کر کے بتا دینا کہ مجھے سرطان تھا۔ میرے بارے میں کس کس نے رپورٹ دی تھی اور کب دی تھی، تم تو سب کچھ دیکھ چکے ہو۔" اس نے پھر بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک پیکٹ نکالا۔ "اس میں پورے ایک لاکھ ہیں۔ سو سو کے نوٹوں کی دس گڈیاں۔ تم چاہو تو شمار کر سکتے ہو۔"

"مجھے تم پر اعتبار ہے۔" نادم نے کہا اور بنڈل اُٹھا لیا، کسی تذبذب کے بغیر۔ اسحاق نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ سودا کر لیا جس میں ہم سب کا ہی فائدہ ہے۔" اسحاق نے کہا۔

"سودا ہم سب نے کیا ہے۔" نادم بولا۔ "فائدے میں کون رہا اور نقصان کس کو ہوا، یہ تو وقت ہی بتائے گا اور وقت کی بھول بھلیاں بہت پُرفریب ہے وکیل صاحب! کوئی نہیں جانتا کہ اگلے موڑ پر راستہ بند ملے گا یا زندگی کی وہ منزل ملے گی جس کی تلاش میں آدمی ایک عمر بھٹکتا رہتا ہے۔ آپ نے ایک پُرسکون موت کی قیمت ادا کی ہے۔ زبیدہ نے ساٹھ دنوں کی اُس کٹھن رفاقت کے بدلے پُرآسائش مستقبل خریدنے کی کوشش کی ہے اور میں نے اس قیمت سے وہ زندگی خریدی ہے جو میرا خواب تھی لیکن کیا یہ ناممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر تخشۂ دار ہو؟ آپ کی لاش کے پوسٹ مارٹم کے دوران میں سرطان کی موجودگی کا راز فاش ہو جائے اور زبیدہ کو کچھ بھی نہ ملے۔ سوائے احساسِ جرم و ندامت اور ایک عمر کی قیدِ تنہائی کے؟"

"تم کیسی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو؟" اسحاق نے کہا۔ "یہ تو اتنا آسان کام ہے کہ تمھیں ناکامی کے امکانات کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہیے۔ ہمیں اسی ہفتے کے آخر تک روانہ ہو جانا ہے۔ اس لیے زبیدہ تم سے ایک بار اور ملے گی لیکن یہاں نہیں، دو ہفتے بعد کراچی میں۔ یہ بتانے کے لیے کہ تم کو کس دن، کس تاریخ کو اور کتنے بجے مجھ سے منوڑا میں ملنا ہے۔ کراچی پہنچنے کے بعد ہوٹل نیشنل سٹی تلاش کرنا تمھارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ دو ہفتے میں تم کراچی کو گھوم پھر کے دیکھ لو گے۔ منوڑا سے کلفٹن تک۔"

"یہ میرے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔" نادم نے کہا۔ "اس لیے میں ہر طرح سے اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے کلفٹن کے کاٹج کا نمبر بتا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ تم کرایہ نامہ دیکھ سکتے ہو۔" اسحاق نے بریف کیس
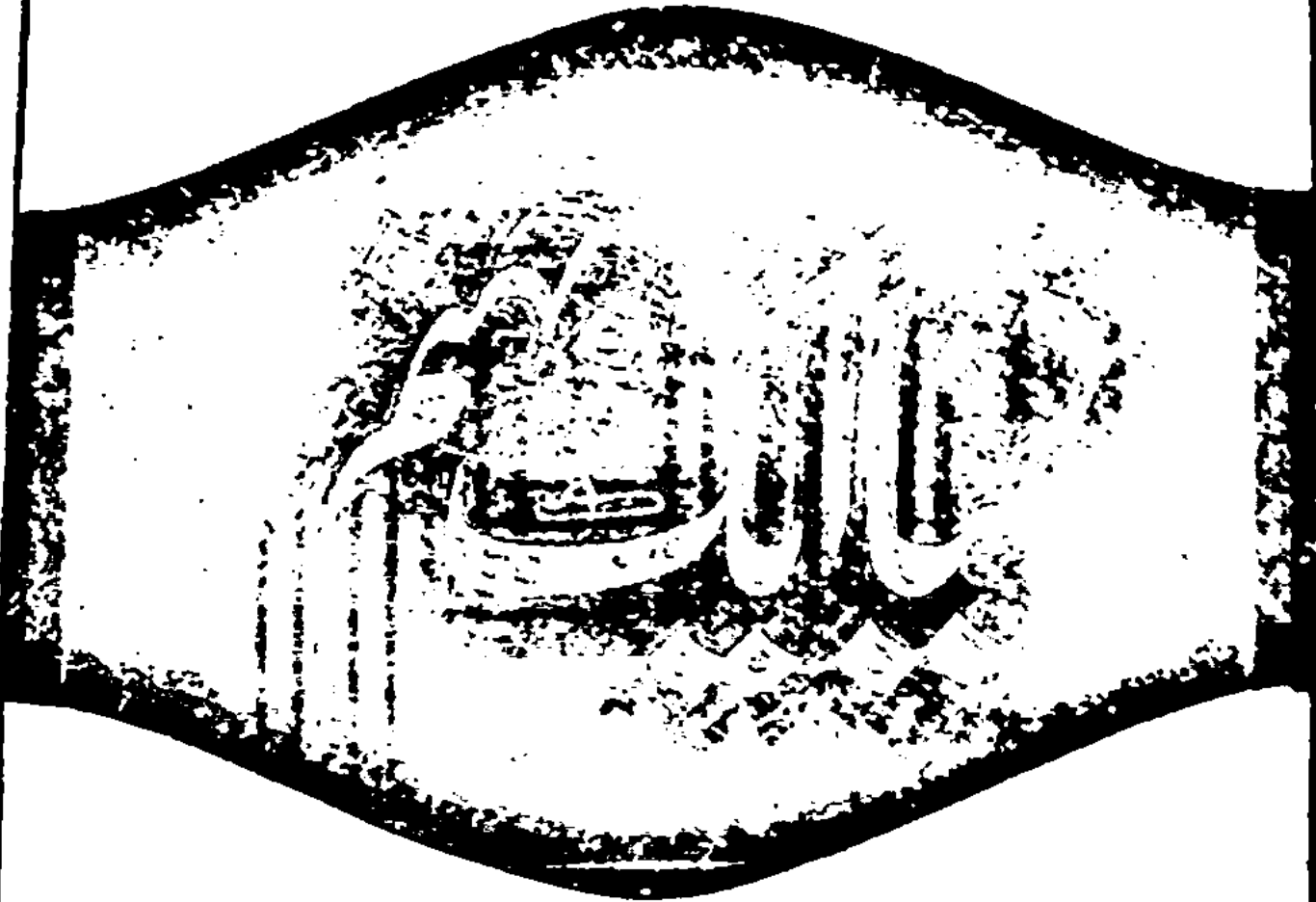
میں سے ایک کاغذ نکالا "یہ فوٹو کاپی مجھے ایجنٹ نے آج ہی فراہم کی ہے۔"

"ٹھیک ہے" نادم نے کرائے نامے پر سرسری نگاہ ڈال کے کہا "اب ایک آخری چیز۔ وہ دو لاکھ کی پالیسی کہاں ہے جو پس از مرگ تمھاری بیوہ کے لیے چار لاکھ سکہ رائج الوقت کا پروانہ ہوگی؟"

اسحاق نے اس کے لہجے کے کڑوے طنز کو محسوس کیا مگر یہ ایک وقتی ردِ عمل تھا۔ جس شخص نے ایک لاکھ لے کر اپنے اصولوں کو دفن کر دیا ہو، ضمیر کی آواز کو دبا دیا ہو اور اپنے نامۂ اعمال میں ایک قتل کا اندراج منظور کر لیا ہو، وہ نارمل تو نہیں رہ سکتا۔ بریف کیس میں سے اس نے اپنی لائف انشورنس پالیسی نکالی۔

"میرا خیال تھا کہ یہ تم سب سے پہلے دیکھو گے۔" اس نے ایک فائل آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔" نادم نے فائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "خدا حافظ مسٹر اسحاق! آج بارہ تاریخ ہے۔ اُنیس تاریخ کو میں ہوٹل نیشنل سٹی کراچی میں آپ کا انتظار کروں گا مسز اسحاق۔ آپ شام کے بعد کسی بھی وقت آسکتی ہیں۔ کاؤنٹر سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مسٹر پاشا... پاشا رفیق ستار۔ مختصراً پی آر ستار کس کمرے میں ہیں۔ کیسا ہے یہ نام؟"

"بہت عجیب!" اسحاق نے الوداعی مصافحہ کر کے کہا "مگر بات یہ ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔"

نادم کے جانے کے بعد بھی زبیدہ اور اسحاق ایک دوسرے کے وجود سے بے نیاز اپنے اپنے خیالوں کی تنہائی کے صحرا میں سرگرداں رہے۔ ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے نظر ملا سکتے۔

"یہ ایک لاکھ قصرِ زبیدہ کا بیعانہ تھا۔" بالآخر اسحاق نے اس خاموشی کو توڑا۔

"فرض کرو وہ لوٹ کر ہی نہ آیا۔" زبیدہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "تمھیں ایک لاکھ کا نقصان ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے، وہ بدعہدی نہیں کرے گا۔" اسحاق نے کہا۔ "وہ ضرورت مند ہے اور اس کو ابھی مزید ایک لاکھ لینے ہیں لیکن ایک لاکھ کے علاوہ اسے ایک اور چیز کی کشش کھینچ لائے گی۔"

"کس چیز کی کشش؟" زبیدہ نے چور بن کے کہا۔

"تمھاری۔" اسحاق ہنسا۔ "تمھارا کیا خیال ہے، میں صرف کاغذات دیکھنے اور دکھانے میں مگن تھا۔ ان نظروں کو نہیں دیکھ رہا تھا جو تم پر تھیں۔ میں نے اس کے خیالات کا عکس اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا۔ وہ بہت آگے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت کو جب میرا وجود دنیا کے لیے خوابِ فردا ہو جائے گا۔ اس کے ذہن نے ان امکانات کو آرزو کی منزل بنا لیا ہے جب وہ ایک دُکھی بیوہ کا سہارا بن کے، اس کے زخمِ دل پر ہمدردی کا مرہم رکھ کے اور اس کے جذبات کا رُخ موڑ کے اسے اپنانے میں کامیاب ہو جائے گا اور پھر دو لاکھ کیا، بیوہ زبیدہ کی ساری دولت اس کی ہوگی۔ زبیدہ سمیت اور قصرِ زبیدہ سمیت۔" اسحاق قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کتنا خوبصورت دھوکا دے رہا ہے وہ خود کو۔ آدمی ذہین ہے اس لیے اپنے آپ کو بچانے کی فکر بھی خود ہی کرے گا۔ اب تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نہ چاہوں تب بھی وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس پر دُہرا جادو چل گیا ہے، تمھارا اور تمھاری دولت کا۔ وہ تمھیں چاہنے لگا ہے زبیدہ! پاگل کا بچّہ۔" زبیدہ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتی رہی۔ میری دولت سے تو سب ہی محبت کرتے تھے مگر مجھے تو پہلے کسی نے بھی نہیں چاہا تھا۔ کیا سچ مچ وہ مجھے چاہنے لگا ہے۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ پاگل صرف میں ہوں مگر اب تو دنیا کی نظر دیکھ رہی ہے کہ نادم واقعی پاگل ہو رہا ہے.. مگر کیا میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ پاگل ہے؟

"قصرِ زبیدہ کے خریدار نے باقی رقم کی ادائیگی کے لیے ایک مہینے کی مہلت طلب کی ہے۔" اسحاق نے کہا۔ "اور سودا سات لاکھ میں ہوا ہے۔ تمام ساز و سامان سمیت جس میں کار بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے جب تم بیوہ ہو کے واپس آؤ گی تو رقم کی ادائیگی تم کو ہوگی اور تم کو عدت کا زمانہ وہیں گزارنا ہے، جہاں تم بیوہ ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ تم سے قصرِ زبیدہ کا قبضہ چار ماہ دس دن سے پہلے نہیں لے سکے گا لیکن تم یہاں کسی کو اٹارنی بنا کے رقم کراچی منگوا سکتی ہو اور تمھارا اٹارنی تمام قانونی کارروائی پوری کر سکتا ہے۔ دوست احباب اور ہمدرد تم سے ملنے یا تعزیت کرنے کے لیے کراچی آئیں گے یا صرف ایک خط لکھیں گے۔ میری موت کے بعد کسی کو حیرت نہیں ہوگی کہ تم نے قصرِ زبیدہ کو کیوں نہ بیچ دیا۔ سب یہی فرض کریں گے کہ پرانی یادوں کے ساتھ تمھارا اس گھر میں رہنا مشکل تھا۔ قصرِ زبیدہ کا خریدار تمھاری مجبوری کو سمجھتے ہوئے تم کو بنک ڈرافٹ یا پے آرڈر ارسال کرے گا اور یہ رقم ہمارے حساب میں ہی جمع ہو سکے گی۔ ہمارے جوائنٹ اکاؤنٹ میں۔ رقم نکلوانے کے لیے ہم دونوں کے دستخط ضروری ہوں گے۔ اس طریقۂ کار پر عمل کر کے ہم دونوں کیلیے برابر کا تحفظ ہے۔ گیارہ لاکھ میں سے ایک لاکھ ہم نادم کو دے چکے ہیں۔ اگر وہ واپس نہ ملے تب بھی دس لاکھ تو ہمارے پاس ہوں گے۔ باقی چھ لاکھ قصرِ زبیدہ کے اور چار لاکھ انشورنس کے۔ یہ رقم

ملنے کے بعد ہم کراچی کی ستر لاکھ آبادی میں گم ہو جائیں گے۔ مسز ایکس وائی زیڈ اور مسٹر ایکس وائی زیڈ کہیں بھی رہ سکتے ہیں اور کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"اور اگر میں کہوں کہ اپنے حصے کے نصف یعنی پانچ لاکھ لے کر الگ ہونا چاہتی ہوں؟" زبیدہ نے کہا۔

"خدا کے لیے ایسا مت کہو۔" اسحاق نے دکھ سے کہا۔ "مجھے تو صرف تین بار طلاق کا لفظ ہی کہنا ہے۔ قانونی طور پر میری موت پہلے ہی واقع ہو چکی ہوگی۔ میں تم کو کیسے زبردستی رکھ سکتا ہوں مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں زبیدہ!"

"جتنا میں اس مسئلے پر سوچتی ہوں، اتنا ہی میرے اعصاب منتشر ہونے لگتے ہیں اسحاق!" زبیدہ نے کہا۔

"اپنے اعصاب کو مضبوط رکھو۔ ابھی تو تم کو میری لاش کی شناخت بھی کرنا ہے۔" اسحاق مسکرایا۔ "اور ایک اچھی بیوی کی طرح سوگ مناتے ہوئے چار مہینے دس دن اکیلے بھی گزارنے ہیں۔"

"تم اتنا عرصہ کہاں غائب رہو گے؟" زبیدہ نے کہا۔

"اکیلا آدمی کہیں بھی رہ سکتا ہے۔" اسحاق بولا۔ "لیکن میں وہیں رہوں گا، تمھارے بہت قریب۔ تمھیں بھی ایک محافظ کی ضرورت بہرحال ہوگی اور میں بھی کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ معاملہ تو یہ باہمی اعتماد کا ہے مگر کیا ہم واقعی ایک دوسرے پر اتنا ہی اعتماد کرتے ہیں جتنا ہمیں کرنا چاہیے۔ معاملہ دس لاکھ کا ہے زبیدہ؟"

"تم چاہو تو مجھ سے دس لاکھ لے کر مجھے قتل کر سکتے ہو۔ مجھے تمھارے ساتھ جینے سے دلچسپی ہے اسحاق! تمھارے بغیر نہیں۔ آزاد ہو کے میں کہاں جا سکتی ہوں۔ تمھاری محبت ہی تو میری زندگی ہے۔"

"لیکن ابھی تم نے پوچھا تھا کہ..."

زبیدہ ہنسی۔ "میں صرف تمھارا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ محبت نے مجھے شکی مزاج اور پاگل کر دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اب میری اور تمھاری محبت کی زندگی کا دوسرا جنم شروع ہو رہا ہے۔ مجھے یہ سب ایک خوبصورت دھوکا لگتا ہے۔ ایسے خواب تو میں نے پہلے بھی دیکھے تھے مگر جب آنکھ کھلی تو ان کی تعبیر بہت بھیانک نکلی۔"

"اب یہ خواب نہیں حقیقت ہے زبیدہ!" اسحاق نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "آؤ اب گھر چلیں۔"

کاٹج ساحلِ سمندر سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن موٹر لوٹ تک پہنچنے کے لیے کافی فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ فائبر گلاس کی کشتی بہت ہلکی پھلکی تھی۔ اس کا انجن بھی ایک کنارے پر بہ آسانی نصب کیا جا سکتا تھا اور اتنی ہی آسانی سے اُتارا بھی جا سکتا تھا۔ گو اس کی رفتار بہت زیادہ نہیں تھی مگر تفریح اور سمندر کے متلاطم سینے پر سفر کے لیے یہ موٹر لوٹ انتہائی محفوظ تھی۔

کاٹج میں دو بیڈ روم تھے اور سمندر کے رخ ایک طویل گیلری سی تھی جس کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ گملے عقبی حصے کے مختصر سے باغیچے میں بھی تھے اور اس باغیچے کا نصف حصہ لان پر مشتمل تھا۔ اندر آنے کا راستہ درمیان سے گزرتا تھا اور پورچ کے نیچے ختم ہو جاتا تھا۔ سڑک کی ایک پتلی سی شاخ اس کاٹج کے گیٹ کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی جس پر ان کا کاٹج آخری تھا۔ باہر سے بالکل ویران نظر آنے والے چند اور گھر اس سے پہلے تھے۔ ان سب کے مکین سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقے کے لوگ تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو صرف ویک اینڈ پر اپنی فیملی یا مہمانوں کے ساتھ ہفتے بھر کی مصروفیات کی تھکن اُتارنے آ جاتے تھے۔ جو یہاں رہتے تھے، وہ بھی بہت کم دکھائی دیتے تھے۔ صرف ان کی آتی جاتی کاریں ان کی موجودگی کا پتا دیتی تھیں۔

"نہ جانے کیوں میری بائیں آنکھ صبح سے پھڑک رہی ہے اسحاق!" زبیدہ نے بالوں کو برش کرتے کرتے کہا۔

"خواہ مخواہ کے وہم پالنا تم عورتوں کی عادت ہے۔" اسحاق نے ہنس کر کہا۔ "اب تم دیر مت کرو۔ یہ بتاؤ کل جب تم اس سے ملی تھیں تو اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔"

زبیدہ کا برش کرنے والا ہاتھ رک گیا اور اس نے آئینے میں اپنے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ "کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ڈر اسے بھی تھا کہ عین وقت پر کوئی دیکھ نہ لے۔ یہ ڈر تو تمھیں بھی ہے۔"

"ہاں۔ مگر یہ محض ایک نفسیاتی دباؤ کا نتیجہ ہے۔" اسحاق بولا۔ "ورنہ خطرے کی بات تو کوئی نہیں۔ ہم دونوں کے پاس بہت وقت ہوگا۔ ہم اگر چاہیں تو اطمینان سے ایک گھنٹا سیر کرتے رہیں۔ کوئی ہم پر شک کیسے کر سکتا ہے۔ یہ کام پوری احتیاط کے ساتھ ہر سمت دیکھ کر مطمئن ہو جانے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔"

"لاش برآمد ہونے کے بعد پولیس کیا سمجھے گی؟" وہ رُک رُک کر بولی۔ "میرا مطلب ہے تفتیش تو ہوگی؟"

"ہاں۔ لیکن سمندر سے ایسی لاشیں ملتی ہی رہتی ہیں، جن کا وارث کوئی نہیں ملتا۔" اسحاق نے کہا۔ "کچھ پولیس اور اسمگلرز کے مقابلے میں مارے جانے والے ہوتے ہیں۔ کچھ اسمگلرز کے نکتۂ نظر سے غدار یا خطرناک ثابت ہونے والے۔ جب اس کے پاس سے کسی قسم کی شناختی دستاویز نہیں نکلے گی اور اس کا چہرہ بھی اس قابل نہ ہوگا کہ تصویر دیکھ کر کوئی پہچان سکے تو لاوارث لاش بالآخر فروخت ہو جائے گی کسی میڈیکل کالج میں لاشیں فراہم کرنے والے ٹھیکیدار کو۔"

"شناختی دستاویزات مثلاً شناختی کارڈ اگر اس کی جیب میں ہوا تو؟"

"وہ میں پہلے ہی رکھوا لوں گا۔" اسحاق نے کہا۔ "تم اب دیر مت کرو۔ یہ نہ ہو وہ انتظار سے مایوس ہو کے یا دہشت زدہ ہو کے بھاگ جائے۔"

"تم گاڑی نکالو۔" زبیدہ نے کہا۔ "میں چند منٹ میں آ رہی ہوں۔"

اسحاق نے گاڑی کو ریورس میں گیٹ سے باہر نکالا۔ اس کی ڈِکی میں فائبر گلاس کی کشتی کا انجن رکھا ہوا تھا۔ کشتی کو اسحاق نے کار کے اوپر باندھ دیا تھا۔ جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا، اسحاق کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان عورتوں کی اُلٹی کھوپڑی سے خدا بچے۔ یہ اگر میدانِ جنگ میں بھی بندوق لے کر نکلیں گی تو پورا میک اَپ کرنے کے بعد۔ اب یہ کوئی وقت اور موقع ہے بناؤ سنگھار کا۔ سمندر میں کون سا مقابلۂ حسن ہو رہا ہے اور ہو بھی تو زبیدہ کا اس سے کیا تعلق۔ وہ بدصورتی کے مقابلے میں شریک ہو تو شاید اوّل آ جائے مگر دنیا میں وہ عورت کہاں ہے جو خود کو حسین نہ سمجھتی ہو۔

زبیدہ ایک ہاتھ میں اپنا سنہرا ہینڈ بیگ لٹکائے نمودار ہوئی اور اسحاق کو پریشانی کے باوجود ہنسی آ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایلفی پرسٹ پننگ کا پروگرام ہے۔ ان کا بس چلے تو سفرِ آخرت میں بھی ہینڈ بیگ ساتھ رکھیں اور میدانِ حشر میں بھی ہینڈ بیگ لے کر جائیں، دنیا کی سب عورتیں۔ سمندر کی نمی اور دھوپ کی تمازت میں بھلا میک اَپ ٹھہر سکتا ہے کہ اس وقت بھی وینٹی بیگ ہمراہ ہے۔ معلوم نہیں کیا کچھ بھر لیا ہے اس میں۔ سمندر میں تو مچھلیاں بھی مفت ملتی ہیں۔

"ایک بار پھر سوچ لو اسحاق۔ کیا میرا ساتھ جانا ضروری ہے؟" زبیدہ نے گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ سورج اب طلوع ہو چکا تھا مگر آس پاس کے گھروں میں نوکر تک ابھی سوئے پڑے تھے۔

"تمہارے لیے اس کی موت کا منظر یقیناً بہت تکلیف دہ ہوگا۔" اسحاق نے کہا۔ "لیکن مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم کو اس کی جامہ تلاشی کے بعد سارے کاغذات نکالنے ہیں۔ تھرماس کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہے۔" زبیدہ نے دوسرے کندھے پر لٹکا ہوا تھرماس دکھانے کے لیے سامنے کیا۔

"ٹھیک ہے۔ نادم کو ساتھ لینے کے بعد جب ہم روانہ ہوں گے تو تم ہمیں کافی پیش کرو گی۔" اسحاق نے کہا۔ "اگر اس نے کافی پی لی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ میں خود اس کے کاغذات نکال لوں گا اور اپنے کاغذات اس کی جیب میں ڈال دوں گا۔ اپنی انگوٹھی اس کو پہنا دوں گا اور اس کے کپڑے خود پہن لوں گا۔ پھر میں اس کو سمندر میں ڈال کے اس کا چہرہ بگاڑ دوں گا۔ ایک گولی سر میں اور دو گولیاں چہرے کے خدوخال بگاڑنے کے لیے کافی ہوں گی۔"

"اور اگر اس نے بھی تمہاری طرح کافی پینے سے انکار کیا؟" زبیدہ نے ایک پھریری لے کر کہا۔

"تو تم کو ہمّت کرنی ہوگی۔" اسحاق نے کہا۔ "تم موقع پاتے ہی اسے گرا دینا۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور اور صحت مند نہیں ہے۔ باقی کام میں کر لوں گا۔ میں فوراً اس پر چڑھ بیٹھوں گا اور اس کا گلا دبا دوں گا۔ باقی کام پروگرام کے مطابق ہوگا۔"

گاڑی ریت کی نمی شروع ہوتے ہی ٹھہر گئی۔ اسحاق نے موٹر لوٹ اُتار کے پانی تک پہنچائی۔ پھر انجن لے گیا۔ "اب تم گاڑی کو واپس کاٹیج میں چھوڑ کر لوٹ آؤ۔ دروازے مقفّل مت کرنا اور اندر ٹرانسسٹر ریڈیو کو آن رکھنا تاکہ معلوم ہو ہم گھر میں ہی ہیں۔ ابھی تو کسی نے بھی ہمیں روانہ ہوتے نہیں دیکھا ہے۔"

"مجھ میں اتنا پیدل چل کر آنے کی ہمت نہیں ہے۔" زبیدہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں موٹر لوٹ میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ تم گاڑی چھوڑ آؤ۔ پلیز!"

اسحاق نے ناگواری کے جذبات کو چھپاتے ہوئے مسکرا کے سر ہلایا۔ اگنیشن کی چابیاں جیب میں ڈالیں۔ جن کے بغیر موٹر بوٹ کا انجن اسٹارٹ نہیں ہو سکتا تھا اور کار کو واپس لے گیا۔ اس کا منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ نادم کو اسحاق بنا کر سپردِ آب کرنے کے بعد وہ زبیدہ کے ساتھ کیماڑی کے ساحل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ وہاں سیکڑوں لانچوں اور کشتیوں کے درمیان اپنی موٹر لوٹ کو چھوڑ دینا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچّوں کے ہجوم میں ان کی طرف کسی کے متوجہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ وہ باہر آ کے الگ الگ ٹیکسی لیں گے۔ زبیدہ گھر لوٹ جائے گی اور گیارہ بجے تک یقیناً کاٹیج میں واپس پہنچ چکی ہوگی۔ کاٹیج کا لینڈ لارڈ ایک بوڑھا ریٹائرڈ گورنمنٹ آفیسر بے خوابی کا مریض تھا اور اکثر رات کے آخری پہر میں خواب آور گولیوں کے زیرِ اثر سونے میں کامیاب ہوتا تھا تو پھر دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔ اسے گھر میں صرف زبیدہ نظر آئے گی جو دوپہر سے پہلے ہی اس کو بتا دے گی کہ اسحاق موٹر بوٹ لے کر گیا تھا اور واپس نہیں آیا ہے۔ لنچ کے بعد وہ پریشانی کا اظہار کرے گی اور بالآخر شریف اور ہمدرد مالک مکان کے ساتھ پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ لکھوا دے گی یا ٹیلی فون پر اپنے شوہر کے لاپتا ہونے کی اطلاع کر دے گی اور پولیس والے خود تفتیش کے لیے آ جائیں گے۔

ہر صورت میں زبیدہ کی پوزیشن محفوظ رہے گی۔

اسحاق نے اپنے لیے نارتھ ناظم آباد سے آگے سخی حسن کی چورنگی کے پاس دو کمروں کا ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی غلط لکھوایا تھا اور فلیٹ کے مالک سے کہا تھا کہ وہ پہلے اورنگی میں تھا۔ اس نے ایک دو دن میں اپنی بیوی اور اپنے سامان کے ساتھ منتقل ہونے کا وعدہ کرنے کے بعد فلیٹ کو مقفل کر دیا تھا۔ اس فلیٹ میں اسحاق کو چار پانچ ماہ گزارنے تھے اور اسی عرصے میں زبیدہ کو آتے جاتے رہنا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ چنانچہ اسحاق کا خیال تھا کہ وہ ضرورت کا تھوڑا سا سامان، کچھ برتن اور فرنیچر بازار سے خرید کر ڈال دے گا۔ اسحاق کے لیے پروگرام کا آخری مرحلہ قصر زبیدہ کی فروخت سے حاصل ہونے والی باقی رقم کی وصولی کے بعد شروع ہوتا تھا اور اس کے پاس بہت وقت تھا۔ وہ تین مہینے میں زبیدہ کو یقین دلا سکتا تھا کہ وہ اب اسے کتنا چاہتا ہے۔ ہر عورت خوبصورت الفاظ کے جال میں اس طرح پھنس جاتی ہے جیسے مکڑی کے جالے میں مکھی۔ زبیدہ کی مجبوری یہ تھی کہ وہ پہلے ہی اسحاق سے محبت کرتی تھی اور ہر حال میں اس کے ساتھ رہنے کی ضد پر قائم تھی۔ اب اسحاق کی محبت پا کے تو وہ سمجھے گی کہ اسے اپنی گمشدہ جنت مل گئی ہے۔ جس دن نقد رقم اسحاق کے ہاتھ میں آئے گی، اسی دن وہ زبیدہ کا گلا گھونٹ کے نکل جائے گا۔ اس شہر میں دس لاکھ کی رقم کے ڈالر خریدنا، غلط نام سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ حاصل کرنا اور رقم کو باہر کے کسی بینک میں منتقل کرانا کوئی مسئلہ نہیں تھا صرف پیسے کا کھیل تھا۔ زبیدہ کی لاش کسی کو کیا بتائے گی کہ قاتل کس جہاز سے کس سمت میں پرواز کر چکا ہے۔

وہ لوٹ کر پیدل چلتا ہوا ساحل تک پہنچا تو زبیدہ موٹر بوٹ میں اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی اور ہوا سے اس کے سنہرے بال اڑ رہے تھے۔ بہت دور دھند میں منوڑا کے جزیرے کا ساحل دکھائی دے رہا تھا اور دوسری جانب گہرے سمندر میں کھڑے ہوئے دیو پیکر بحری جہازوں کے سائے افق پر پھیلے نظر آتے تھے۔ اسحاق نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجنے والے تھے اور درمیانی فاصلہ پون گھنٹے کا تھا لیکن ایک گھنٹا لگ جاتا تب بھی وہ وقت پر پہنچ سکتے تھے۔ اس نے انجن کی ڈوری کھینچ کر انتظار کیا۔ تیسری کوشش میں انجن اسٹارٹ ہو گیا تو اس نے مسکرا کے زبیدہ کو دیکھا۔ زبیدہ کا رنگ اڑا ہوا تھا اور چہرہ بے جان ہو رہا تھا۔ اسحاق کو ایک اندیشہ تھا تو یہ کہ کہیں موٹر بوٹ دھوکا نہ دے جائے مگر یہ دوسرا اندیشہ زیادہ پریشان کن تھا کہ کہیں زبیدہ کا خوف اس کے ہسٹریا کی صورت نہ اختیار کرے۔ "خدا کے لیے ہمت سے کام لو۔ یہ نہ ہو وقت سے پہلے ہی تم بے ہوش ہو جاؤ۔" اسحاق نے کہا۔

ایک پھیکی، بے جان اور خوفزدہ کر دینے والی مسکراہٹ زبیدہ کے سپاٹ چہرے پر نمودار ہوئی۔ وہ خاموشی سے کشتی کو گہرے پانی کی جانب بڑھتا دیکھتی رہی۔ کشتی کی رفتار آہستہ آہستہ زیادہ ہونے لگی تھی۔ زبیدہ کا دل اس کے انجن کی آواز سے زیادہ تیز دھڑک رہا تھا اور اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ کشتی اب ساحل سے ایک میل دور آ چکی تھی اور چھوٹی سی کشتی بڑی بڑی لہروں پر زیر و زبر ہونے لگی تھی۔ اسحاق کنارے پر کھڑا منوڑا کے ساحل کو دیکھ رہا تھا جس کا لائٹ ہاؤس اس کی منزل تھا۔ زبیدہ نے سنہرے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور اسحاق کا ریوالور نکال لیا۔ اس ریوالور کا لائسنس بھی اسحاق کے نام پر تھا۔ اپنی تمام ہمت کو مجتمع کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک قدم آگے بڑھی۔

اسحاق نے آہٹ پر چونک کر پیچھے دیکھا اور منجمد ہو گیا۔

"زبیدہ... یہ... یہ کیا ہے؟"

"یہ کھیل کا اختتام ہے۔" زبیدہ نے خود کو سنبھال کے کہا۔ "زندگی میں سب سے پہلا اور خوبصورت دھوکا تم نے مجھے گیارہ سال قبل دیا تھا۔ مجھے بھی اور میرے باپ کو بھی۔ اس وقت میں پاگل تھی چنانچہ تم نے میرے باپ کو دُکھ دے دے کر مار ڈالا اور میری ساری دولت ہتھیالی۔ پھر گیارہ سال تک تم مجھے دھوکے دیتے رہے لیکن اب میں پاگل نہیں ہوں۔ اب تم اپنی محبت کا خوبصورت دھوکا دے کر دوبارہ میری دولت مجھ سے نہیں چھین سکتے اسحاق! ایک بدصورت عورت کو بھی آخر کتنی بار خوبصورت دھوکا دیا جا سکتا ہے۔"

"زبیدہ!" اسحاق چلّایا مگر اس کی آواز لہروں کے شور اور فائر میں دب گئی۔ پیشانی پر لگنے والی پہلی گولی نے اسے سمندر میں الٹ دیا۔ وہ پانی میں گرا اور پھر ابھرا۔ زبیدہ نے اس کے چہرے کا نشانہ لے کر دوسری گولی چلائی۔ اسحاق کی خون آلودہ بھیانک صورت پھر پانی میں غائب ہو گئی۔ وہ تیسری بار سامنے آیا تو زبیدہ نے ریوالور اٹھایا اور نیچے کر لیا۔ اسحاق کے چہرے پر اب کچھ نہیں رہا تھا۔ نہ آنکھیں، نہ لب اور نہ ناک۔ اس کا چہرہ کسی عفریت کا چہرہ لگتا تھا۔

زبیدہ نے کشتی کا رخ موڑا اور ریوالور کو سمندر کے سپرد کر دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے دیکھا مگر سمندر کی لہروں میں اسحاق کی لاش غائب ہو چکی تھی۔ اس نے تھرماس کھول کے کانپتے ہاتھوں سے کافی نکالی۔ آدھی کافی نیچے گر گئی مگر باقی اس کے حلق سے اتر گئی۔ اس نے پورا تھرماس خالی کر دیا لیکن اس کے پیٹ میں مشکل سے ایک کپ کافی پہنچی۔ چند منٹ میں اس کی کپکپی ختم ہو گئی۔ اس نے تھرماس کو بھی سمندر میں پھینک دیا اور کشتی کی رفتار بڑھا دی۔

آہستہ آہستہ اس کی جسمانی کمزوری رفع ہونے لگی تھی۔ انگریز کہتے ہیں کہ ہنسنے والے تو بہت ہوتے ہیں مگر دیکھنا یہ چاہیے کہ آخری بار کون کس پر ہنستا ہے آدمی تقدیر پر یا تقدیر آدمی پر۔ ہر قدم پر زبیدہ کو فریب دینے والا اسحاق نہیں جانتا تھا کہ وہ ہر قدم پر فریب کھا رہا ہے۔ اس کے دام کا ہر حلقہ خود اسے ہی اسیر کرتا جا رہا ہے اور جو گڑھے وہ دوسروں کے لیے کھود رہا ہے" وہ سب اس کے اپنے جھوٹے یقین کے مدفن ہیں۔ اسے تو یہ بھی یقین تھا کہ کافی میں زہر ہوگا۔ جیسے اسے یقین تھا کہ سنہرے پرس میں میک اپ کے سامان کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

کیماڑی کے ساحل پر اس نے اپنی موٹر بوٹ کو دو کشتیوں کے درمیان باندھا تو چند افراد نے اسے دلچسپی سے دیکھا مگر وہ ساتھ ساتھ ملی ہوئی لانچوں پر چلتی اور خود کو سنبھالتی آگے بڑھتی گئی۔ آخری لانچ پر سے سیڑھیوں پر چھلانگ لگا کے اس نے خود کو گرنے سے بچایا اور تماشا دیکھنے والوں کی پروا کیے بغیر ہال سے گزر کے باہر آگئی۔ ہال میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے، خوانچے والے، آوارہ گرد جمع تھے۔ باہر کاروں کے ساتھ رکشا اور ٹیکسی قطار باندھے کھڑے تھے۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھی۔

"صدر چلو" اس نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد کہا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اس نے نادم سے دس بجے تک پہنچ جانے کا وعدہ کیا تھا اور ابھی صرف نو بجے تھے ٹیکسی کو اس نے ریگل کے اسٹاپ پر روک دیا اور ہوٹل نیشنل سٹی تک کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ مسٹر پی آر ستار کا کمرہ سیکنڈ فلور پر تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ لڑکھڑائی۔ نادم نے اسے سنبھال لیا اور بستر پر لٹا دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"کیا بات ہے؟" نادم نے متفکر لہجے میں کہا "کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔"

زبیدہ نے نفی میں سر ہلایا "تم تو مجھے کوئی خوبصورت دھوکا نہیں دے رہے ہو نا؟"

نادم مسکرایا "جب تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم کا زندہ بنو گے یا پرستار تو میں نے کوئی جواب اپنی زبان سے نہیں دیا تھا لیکن ایک جواب میرے دل نے بھی دیا تھا۔"

"وہ میں نے سمجھ لیا تھا مگر نادم! یہ دل آدمی کو بڑا خوار کرتا ہے۔ بڑے خوبصورت دھوکے دیتا ہے۔"

"مگر یہ تو کوئی خوبصورت دھوکا نہیں" نادم مسکرایا "میرا تو نام ہی پرستار ہے۔ پی آر ستار کو ملا کے پڑھو۔ میں نے اپنا اور تمہارا پاسپورٹ اسی نام سے حاصل کیا ہے۔"

"ابھی میں تمہاری [illegible] نہیں ہوں [illegible] مجھے چار مہینے تو گزارنے ہی ہیں" وہ بولی "پھر ہم نکاح کر لیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تم اب واپس کاٹیج جاؤ گی اور پولیس کو رپورٹ دو گی۔"

زبیدہ نے پھر نفی میں سر ہلایا "میں اب کہیں بھی نہیں جا رہی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"پاگل مت بنو۔ کیا تم کو اپنے قصر زبیدہ کی فروخت سے حاصل ہونے والی چھ لاکھ کی رقم اور انشورنس کے چار لاکھ روپے نہیں لینے ہیں" نادم نے کہا۔

"نہیں نادم! وہ دس لاکھ روپے نہیں، دس لاکھ انگارے ہیں۔ میں ان کو چھونا بھی نہیں چاہتی" زبیدہ نے کہا "مجھے ان کے بدلے زندگی کی چند خوشیاں مل جائیں تو بہت ہیں۔ یہ دولت تو ہمیشہ میری دشمن رہی ہے جس نے میرے دامن کو محبت سے خالی رکھا۔ اب مجھے تھوڑی سی محبت دے دو۔ صرف اتنی کہ میں اس کے سہارے زندگی گزار لوں۔ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ میں قصر زبیدہ کی مالک اور زاہد اسحاق بیرسٹر کی بیوہ نہیں ہوں۔ میں وہ عورت ہوں جس کو دنیا نے پاگل سمجھا۔ اس وقت بھی جب میں پاگل نہیں تھی، میرے شوہر نے مجھے پاگل جانا۔ آج تم بھی کہہ رہے ہو کہ میں پاگل ہوں" وہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "اس لیے پاگل ہوں کہ میں دس لاکھ چھوڑ کے صرف محبت کی خیرات مانگ رہی ہوں۔ میں واپس نہیں جاؤں گی نادم! مجھے اپنے ساتھ لے چلو... آگے... مستقبل کی طرف... خوشیوں کی طرف... محبت کی طرف... وہی ہے میری منزل۔"

نادم نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا "چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔ میں نے وہ ایک لاکھ بھی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا جو میں نے اسحاق سے لیے تھے۔ صرف اس لیے کہ میں اس کے دل میں شک پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے تمہارے دس لاکھ سے کیا غرض۔ تمام عمر بھٹکنے کے بعد تو میں تم تک پہنچا ہوں۔ میری منزل تو تم ہو۔ چلو اٹھو، ہمارا سفر شروع ہو چکا ہے اور یہ سفر کوئی سراب نہیں ہے، کوئی خوبصورت دھوکا نہیں ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے زبیدہ جو کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ میں اپنا بل ادا کر چکا ہوں۔ آؤ" وہ آنسو پونچھ کے مسکرائی اور اس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ ایک ساتھ قدم بڑھاتے، وہ ایک ایک زینہ نیچے اترتے گئے اور اپنی نئی دنیا کی جانب بڑھتے گئے۔ ویران سمندر میں ایک لاش کے بگڑے ہوئے چہرے کو لہروں کے تھپیڑے ساحل سے اور دور کرتے رہے جہاں ننھی ننھی مچھلیاں اور شارک جیسی مچھلیاں اس سے رزق حاصل کرنے کے انتظار میں تھیں۔